مُسدسِ حالی

مع سوانح شخصیت، آرائے اکابرین تشریح و تجزیہ

مُصنّف:

مولانا الطاف حسین حالی

تحقیق، تدوین و تشریح:

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

مسدّس حالی

مع

سوانح شخصیت، آرائے اکابرین، تشریح و تجزیہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

ناشر

.....

انتساب

حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر ''مسدسِ حالی'' کا انتساب کرنل انور احمد کے نام
جنہوں نے 1979ء میں ٹورانٹو میں ''مسدس حالی'' کی تصنیف کی پہلی صدی
برگزار کی۔

☆.....☆.....☆

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقی
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)
		ایم ایس (برطانیہ)
		ایف سی اے پی (امریکہ)
		ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق وتنقید
شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک، کینیڈا
شریک حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)
		دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)
تصانیف	:	(53) شہید 1982)) جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبال کے عرفانی

زاویے، ان شاءاللہ خاں ان شاء، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیر، طالع مہر، سلک سلامِ دبیر، تجزیہ یادگار انیس، ابواب المصائب، ذکر دُرّ باران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، روپ کنور کماری، دُرّ بار رسالت ﷺ، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب مصحف تغزل، ھوالنجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالب دیوان نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رباعیات دبیر، سبدِ سخن، دیوان غالب فارسی، فیض فہمی، مطالعہ دبیر کی روایت، دیوانِ سلام وکلام انیس، رباعیات انیس، رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری، کلیات حالی جلد اوّل ودوم مسدس حالی، حالی فہمی، حالی کی نظمیں، حالی کی غزلیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، بچوں کے حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، دیوان حالی فارسی

زیرِ تالیف : تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانی لافانی، تجزیہ رباعیات، فراق گورکھپوری، دو شاہکار نظمیں، اقبال کے چار مصرعے، رباعیات بیدل، باقیاتِ فیض۔

فہرست

☆ پیش لفظ: ڈاکٹر سید تقی عابدی ---------- 8
☆ عکس مولانا حالی ---------- 16
☆ عکس تحریر مولانا حالی ---------- 17
☆ عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالی ---------- 18
☆ مکتوب سرسید احمد خان بنام مولانا حالی ---------- 19
☆ شجرہ مولانا حالی ---------- 22
☆ یادگار گروپ فوٹو ---------- 23
☆ حالی کی کہانی حالی کی زبانی: مولانا حالی ---------- 24
☆ دیباچہ مسدس مدوجزر اسلام: مولانا حالی ---------- 30
☆ دیباچہ ضمیمہ مسدس: مولانا حالی ---------- 36
☆ حالی کی حیات اور شخصیت: ڈاکٹر سید تقی عابدی ---------- 39
☆ مسدس کا اجمالی تجزیہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی ---------- 72
☆ مسدس پر اکابرین کے تاثرات: ڈاکٹر سید تقی عابدی ---------- 113
☆ اقتباس مسدس: ڈاکٹر سید تقی عابدی ---------- 144
☆ کتابیات ---------- 266

☆.....☆.....☆

پیش لفظ

یہ بھی اُردو شعر و ادب کی نا قدری ہے کہ اس کے مشاہیر شاعروں، ادب کے عظیم ترین محسنوں، اور معماروں کی قدر دانی جیسے ہونی تھی ویسے ہو نہ سکی۔ الطاف حسین حالؔی، غالبؔ اور شیفتہؔ کے شاگرد، سر سید کے فرماں بردار، محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانی ڈپٹی نذیر احمد، صدر یار جنگ شیروانی اور چراغ علی کے مصاحب، علی گڑھ کالج اور تحریک کے اکابرین کے وفادار، حیدر آباد، رام پور، پٹیالہ کے حکمرانوں روسا اور انگریز حکومت کے مدح شعار ممتاز شاعر تھے۔ وہ اگر چہ ترقی پسند شاعر، تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے پیشوا تھے جنہوں نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمۂ شعر و شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یادگار غالبؔ اور حیات سعدیؔ کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار چھوڑے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ چناں چہ انہوں نے اگر مرثیۂ غالب سے یادگار غالب تک شعری، علمی، تہذیبی اور تنقیدی قدروں کو روشناس کروایا تو حیاتِ جاوید، مسدس، حقوقِ نسواں اور اولاد کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی نظموں سے برصغیر کی قوم اور خوابیدہ ملت میں تعلیمی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور ملی شعور کو بیدار کر کے ایسی فضا بنائی کہ اس میں آگے چل کر علامہ اقبالؔ، سر راس مسعود، ابوالکلام آزاد، ظفر الحسن، عبدالحق غلام سیدین جیسے معنوی شاگردوں نے ایک پسماندہ اور بے حس ملت کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں پہنچا دیا۔ اس لیے اگر حالؔی کو اُردو شعر و ادب کا مجدد کہا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ حالؔی کا کلام قومی ادبی اور ملی سرمایہ ہے چناں چہ جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔ حالی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ حالی شناسی پر راقم کی درجن بھر کتابیں اسی جذبے کے تحت ان کی سو سالہ برسی کے موقع پر پیش کی جا رہی ہیں جس کا ڈول ہم نے

کئی سال قبل اُردو کے اندھے کنویں میں ڈال کر چلو چلو پانی جمع کر کے جامِ سخن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے ہم کسی تحسین اور صلے کے منتظر اس لیے..... بھی نہیں ہیں کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

دِلّی اور لاہور میں حالی کی غزلوں، نظموں، قطعوں، رباعیوں اور بعض شخصی مرثیوں سے لوگ واقف تھے جنہیں حالی مشاعروں، محفلوں اور جلسوں میں پڑھتے تھے۔ ان کے کلام کے بعض نمونے اُس دور کے گلدستوں، تذکروں، اخباروں اور رسالوں میں گاہے گاہے چھپتے رہے۔ حالؔی کی بعض نظمیں علاحدہ علاحدہ مختلف مقامات پر شائع ہوتی رہیں جن میں مناجات بیوہ مثنوی حقوق اولاد، شکوۂ ہند، تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی اور چپ کی داد وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن باقاعدہ طور پر حالؔی کی زندگی میں مسدس حالی اور تین مجموعے کلام شائع ہوئے۔

مسدس حالی: 1879ء

ضمیمہ مسدس حالی: 1886ء

مجموعہ نظم حالی: 1890ء میں۔

اور دیوان حالی معہ مقدمہ شعر و شاعری 1893ء میں۔ حالی نے اپنی زندگی کے آخری سال یعنی 1914ء میں اپنی فارسی اور عربی نظم و نثر کا مجموعہ ''ضمیمۂ اردو کلیاتِ نظم حالی'' مرتب کر کے شائع کیا لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی چناں چہ ضمیمہ تو چھپ گیا مگر کلیات کی ترتیب اور طباعت نہ ہو سکی۔

حالی کے انتقال کے بعد اگرچہ حالی کے نواسے نے حالی پبلشنگ ہاؤس سے حالی کی مختلف اہم تصانیف کو عمدہ طریقے پر شائع کیا لیکن کلیات نظم حالی کی طباعت میں مشکلات اس لیے رہیں کہ حالی کی بعض نظموں کے حقوقِ اشاعت بعض قومی اداروں اور تاجروں کو حالؔی نے دے رکھے تھے اور وہ ان نظموں کی کلیات میں شمولیت پر راضی نہ تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے مختلف مقامات اور مختلف چھاپہ خانوں سے حالؔی کی تصانیف جن میں علاحدہ علاحدہ رباعیات حالی، قطعات حالی، مسدس حالی اور حالی کی دیگر نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

1922ء میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کا غیر مدون کلام یعنی باقیاتِ حالی کا مجموعۂ

''جواہرات حالی'' کے نام سے شائع کیا۔ ''جواہرات حالی'' کی پذیرائی سے متاثر ہو کر شیخ اسماعیل پانی پتی نے ''کلیات نظم حالی'' کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے پہلی اور دوسری جلد میں ''دیوان حالی'' مطبوعہ 1893ء اور ''جواہرات حالی'' 1922ء میں شائع شدہ کلام کو اصناف وار ترتیب دے کر کلیات 1924ء میں پیش کیا۔ افسوس ہے کہ جلد سوم اور چہارم کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ تقریباً چالیس سال بعد افتخار احمد صدیقی نے دو جلدوں میں کلیات نظم حالی کے نام سے حالی کا سارا کلام مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا جو حالی کے کلام کے موجودہ نسخوں میں معتبر کلیات ہے۔ حالی کے کلام کی کمیابی اور پرانی کتابت کی غلطیوں سے بھرے ہوئے نسخوں کی طباعت حالی شناسی میں خلل انداز ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چالیس پچاس سال میں حالی پر کوئی خاص کارآمد تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہو سکا۔ کچھ عمدہ مقالے، تبصرے اور تجزیے مقدمہ شعر و شاعری پر ہر دور میں ہوتے رہے اور یہ صدائیں بھی دو تین دہائیوں سے خاموش ہو گئیں۔ راقم نے حالی شناسی کے فروغ کے لیے حالؔی کے کلام کو صرف نصاب میں شامل ضروری نہ جانا بلکہ عوام میں بھی اس کے چرچے کو لازم جان کر اس کی فراہمی کا منصوبہ بنایا جس میں اکیسویں صدی کے اُردو ماحول میں حالی کا کلام جدید علمی تحقیقی اور تنقیدی زاویوں پر استوار کر کے تجزیے اور تشریح کے ساتھ ایسی ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے کہ عالم اور عامی اس سے مستفید ہو سکیں۔ چناں چہ حالی کے کلام کے ہر حصے پر دقیق دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی آبیاری سے گلشن تجزیے اور تشریح کو سنوارا گیا۔ کلیات والی دو جلدوں میں، حالی فہمی، مسدس حالی، حالی کی نظمیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کی غزلیں، حالی کی نظمیں، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، بچوں کے حالی اور دیوان حالی فارسی اسی گلشن کے پھول ہیں جن کو جدا جدا گل دانوں میں سجایا گیا ہے۔ حالی کے منظوم کلام کی تشریح اور تدوین کے لیے مطبوعہ نسخوں سے استفادہ کیا گیا کیوں کہ حالی کا قلمی غیر مطبوعہ کلام سب کچھ فسادات میں ضائع ہو گیا۔

حالی کی پوتی مشتاق فاطمہ کی صاحبزادی صالحہ عابد حسین اپنے مکتوب بنام ڈاکٹر رفیق حسین مرتب مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتی ہیں۔ ''فسادات کے بعد حالؔی مسلم ہائی اسکول جو حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ان کی یادگار کے طور پر قائم کیا تھا ختم کر کے اُسے جین ہائر سکنڈری اسکول بنا دیا

گیا تھا جواب ڈگری کالج ہوگیا ہے۔ان کا مکان کٹوڈین کے قبضے میں گیا۔کتب خانہ کا تو پہلے ہی اسکول کو دے دیا گیا تھا۔میرے والد اور چچا کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں نادر اور بیش بہا کتابیں تھیں وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔''

حالی کے مطبوعہ کلام کے کئی نمونے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ہم نے کلام میں جہاں اختلاف پایا وہاں حالی کی زندگی میں شائع شدہ کلام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔دیوان حالی، مسدس حالی، مجموعہ نظم حالی، ضمیمۂ کلیاتِ حالی اور مختلف معروف نظمیں جو شائع ہو چکی تھیں ان سے استفادہ کیا گیا۔''جواہرات حالی'' اور دیگر نسخوں کو دوسری کتابوں کے حوالوں سے دیکھا گیا ہے حالی کے قدیم کلیات میں جو مسائل تھے جہاں کئی الفاظ ملا کر لکھے جاتے تھے اور بعض نسخوں میں یاں' واں' ترے' مرے کو یہاں' وہاں' تیرے' میرے لکھا گیا جس سے شعر وزن سے ساقط ہو گیا تھا اس کلیات میں ان نقائص سے اجتناب کرنے کے لیے کلیات نظم حالؔی کی دونوں جلدوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا جن کو ڈاکٹر افتخار صدیقی نے مرتب کیا اور ضروری حاشیے درج کیے۔ڈاکٹر افتخار صدیقی کا کلیات موجودہ نسخوں میں سب سے عمدہ اور نقائص سے پاک ہے۔ہم نے ان کے بعض حاشیوں کو شامل کر کے (اص) کی علامت کا نشان رکھا ہے۔حالی کے تمام حاشیوں کو درج کیا ہے جنہیں بعض ناشرین نے کار اضافی جان کر نکال دیا تھا۔

حالی وہ ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے روایتی اور جدید شاعری کی ہے۔جہاں تک حالی کی غزلیات کا تعلق ہے انہوں نے قدیم غزلوں کے نمونۂ کلام کو اپنے دیوان میں رکھا تا کہ قدیم اور جدید کا فرق ظاہر ہو۔چناں چہ قدیم روایتی غزلوں پر ''ق'' کا نشان دیوان میں لگا دیا جس کو کئی ترتیب اور تدوین کرنے والوں نے چنداں اہمیت نہ دی۔اس کلیات میں ڈاکٹر افتخار صدیقی کے نسخے کی روش اختیار کی گئی ہے۔تا کہ آیندہ قدیم اور جدید غزلیات میں خلط ملط نہ ہو چنان چہ قدیم اور جدید غزلیات علاحدہ علاحدہ ترتیب دی گئی ہیں۔ناظرین حالی کی قدیم عشقیہ شاعری اور جدید مقصدی شاعری کو ان علامات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔حالی اس فکری انقلاب کے بارے میں دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی

مضائقہ ہوتا تھا.....مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا.....جس شاعری پہ ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔

حالی نے اُردو اور فارسی میں رباعیات کہی ہیں۔اُردو اور فارسی کی عمدہ رباعیات کے سامنے حالی کی رباعیات معمولی اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔حالی کی رباعیات کے مجموعے کئی شائع ہوئے لیکن سب سے اچھا مجموعہ جس میں حالی کی سب سے زیادہ رباعیات ہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ترتیب شدہ ہے جو انہوں نے حالی کی سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر شائع کیا تھا۔اس کلیات اور مجموعہ رباعیات میں ہم نے اسی نسخے سے استفادہ کیا جسے افتخار صدیقی نے نظم کلیات حالی میں شامل کیا ہے۔حالی کی اُردو رباعیات کی تعداد (120) اور فارسی رباعیات کی تعداد (20) ہے۔ شیخ اسماعیل کے مرتبہ رباعیات کے مجموعے میں کتابت کی غلطیاں اور بعض الفاظ کا املا غلط درج ہونے کے باعث مصرعے وزن سے خارج ہو گئے تھے وہ تصحیح کر کے شامل کر لیے گئے۔

اور مزید ایک قطعہ جو غلطی سے رباعیوں میں شامل تھا خارج کر دیا گیا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

موتی ہزار قصر سمندر میں ہوں نہاں

حالی منکسر المزاج تھے انہیں واعظ اور ناصح بننے میں حیا آتی تھی۔خود لکھتے ہیں:

''بعض رباعیوں اور قطعوں میں اخلاقی مضامین پیش کیے گئے چنان چہ شاعر کو پند و نصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔مگر یہاں شاعر ناصح سے اِس لیے مختلف ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے جب کہ پاک ناصح جگ بیتی کا ذکر کر رہا ہے۔''

ہم نے حالی سے منسوب ''نعتیہ خمسہ'' کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جواہرات یعنی مجموعۂ باقیاتِ حالی میں شامل کیا تھا اور ''خستہ'' حالی کا تخلص بتایا تھا اس کلیات میں الحاقی کلام بتا کر شامل نہیں کیا۔یہ نعتیہ خمسہ فارسی میں ہے اور اس کا سن طباعت 1856ء ہے جب حالی کی عمر مشکل سے اٹھارہ برس ہے۔افتخار صدیقی مرتب ''کلیات نظم حالی'' بھی اس کو حالی کا کلام نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اِسے شامل کیا ہے۔ہم نے پورا تحقیقی مضمون اس ضمن میں ''حالی فہمی'' میں ناظرین کی سہولت کے لیے شائع کیا ہے۔

حالی کی زندگی میں جوان کے فارسی اور عربی کلام کے نظم ونثر کا مجموعہ بنام ضمیمۂ اردو کلیات شائع ہوا تھا اُس سے نثر کے حصے کو چھوڑ کر فارسی عربی کا منظوم کلام یہاں شامل کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی نے سرسید کی تحریک پر مسدس لکھا۔ مسدس کا سب سے پہلا ایڈیشن جون 1879ء میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر سرسید نے جو مکتوب لکھا تھا ہم نے اس کو اس دستاویز کا جز بنایا ہے۔ سرسید کا یہ کہنا کہ بارگاہ ایزدی میں خالی ہاتھ نہیں آیا بلکہ مسدسِ حالی لکھوا کر لایا ہوں اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سرسید مسدسِ حالی کے گرویدہ تھے۔ چناں چہ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' جلد 1880ء ایڈیشن بھی ایک ہی سال میں ختم ہوا تو مسدس کے تیسرے ایڈیشن میں حالؔی نے مسدس پر نظر ثانی کی، کئی مصرعوں کو بدلا، بندوں میں اضافہ کیا اور ضمیمہ کا بھی اضافہ کر کے مسدس کے چھے سال بعد 1886ء میں شائع کروایا۔ حالؔی کے مسدس میں (294) بند ہیں اور ضمیمہ میں (164) بند ہیں اس طرح کل بندوں کی تعداد (458) ہے حالی کے سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر 1935ء میں ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمے کے ساتھ مسدس کا صدی ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ ہم نے یہاں اسی صدی ایڈیشن کے نسخے سے استفادہ کیا۔

حالی نے اپنے کلام بالخصوص مسدس اور بعض نظموں میں پسماندہ بے حرکت مسلمان قوم کے اسلاف اور اکابرین کے کارناموں کو بیان کر کے یہ تلقین کی ہے کہ تم اب بھی یہ کام کر سکتے ہو اس طرح ان کا کلام مسلمانوں کی غیرت کی رگ کو پھڑکتا اور سوئی ہوئی قوم کے لیے ایک تازیانہ کا کام کرتا ہے کہ بیدار ہوں اور فلاکت وہلاکت سے نجات حاصل کرو۔

حالی نے اپنے نظموں کے پہلے مجموعے میں چودہ نظمیں شائع کیں جس میں مدوجزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد اور شکوہ ہند کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے اور مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ حالی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں 1874ء تک کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ 1874ء میں جب محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائیڈ کی تائید سے ایک مشاعرے کی بنا ڈالی گئی جس میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوع دیا گیا تا کہ اُردو شاعری کو فرسودہ عشقیہ اور مبالغہ آمیز مضامین سے نجات دلوائی جائے تو انہوں نے بھی جو نظمیں پڑھیں یعنی برکھارت، نشاط امید، حب الوطن اور مناظرہ رحم وانصاف کو اس مجموعہ کا حصہ بنایا۔ حالی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ

انہیں اگر چہ مغربی شاعری کے اصولوں سے واقفیت نہیں لیکن انہیں مبالغہ اور اغراق سے نفرت ہے جس کا ثبوت خود ان کا کلام ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار اور 1872ء کے جاری شدہ تہذیب الاخلاق کے علاوہ مغربی لٹریچر کی ترجمہ شدہ کتابوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں لٹریچر کا انقلاب برپا کر دیا تھا جس کی وجہ سے مغربی طرز کی نظموں کی پذیرائی ہونے لگی۔ حالی کہتے ہیں:

> میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہو سکا اور اُن صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار

یعنی میں نے دنیائے معانی کی خاک میں کوشش کے بیج بوئے ہیں تاکہ ہمارے بعد اس کے پھل دینے والے درخت سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

حالی نے دیوان کے دیباچہ میں لکھا: ''کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے انجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے، اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے۔

ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون

سی ہے۔ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرز بیان میں کوئی ایسی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔''

حالی نے یہ بھی بتایا کہ انسان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا سکے۔ نئے خیالات سے مراد وہی عام خیالات ہیں جن کو شاعروں نے ترک کر دیا تھا اور معمولی خیالات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا جب کہ انہی خیالات میں زندگی کے راز چھپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ نظموں میں اسلاف کے اقوال واقعات اور حکایات کو بھی بیان کیا گیا۔

طوالت و تکرار حالی کی نظموں کا سب سے بڑا عیب ہے۔ مثلاً: مناجات بیوہ جو حالی کی بہترین نظم ہے اس میں طوالت اور تکرار نے اسے کم اثر کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو نکال بھی دیا جائے تو نظم پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔ حالی کو اگر موقع ملتا تو شاید ان نظموں کی تکرار اور طوالت پر نظر ثانی کرتے۔ ہم مطمئن ہیں کہ نسل آیندہ اس کا انتخاب کرے گی۔

جہاں تک کلیات کی ترتیب اور تدوین کا تعلق ہے جو کم از کم تین طرح سے مرتب کیا جا سکتا ہے یعنی اضافی ترتیب، موضوعاتی ترتیب یا زمانی ترتیب۔ حالی کے پہلے کلیات کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اُردو کے قدیم اور مروجہ اسلوب یعنی اصناف سخن کے اعتبار سے جمع کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کلیات نظم حالی کو موضوعاتی اعتبار سے تقسیم کر کے ہر صنف میں زمانی دور کو بھی ملحوظ رکھا۔ راقم نے بھی کلیات حالی میں اضافی ترتیب دے کر جہاں منظومات کے سنین کا تعین ہو سکا انہیں تاریخوں کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر بیدار بخت اور کرنل انور احمد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے وہ تمام کتابوں کا بندوبست کیا جو میری لائبریری میں نہیں تھیں۔

خیر اندیش

ڈاکٹر سید تقی عابدی

☆.....☆.....☆

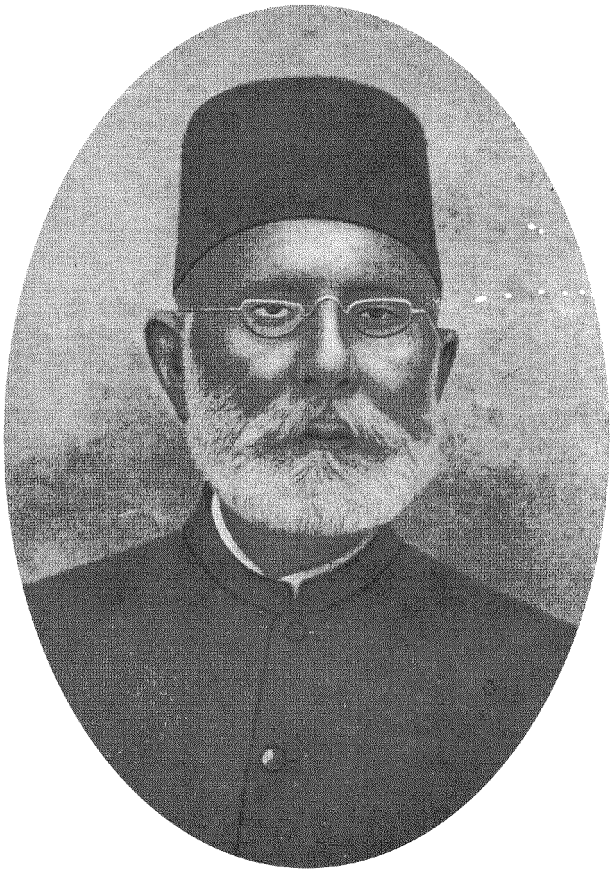

مولانا الطاف حسین حالؔی

1837ء.....1914ء

عکس تحریر مولانا حالی مرحوم

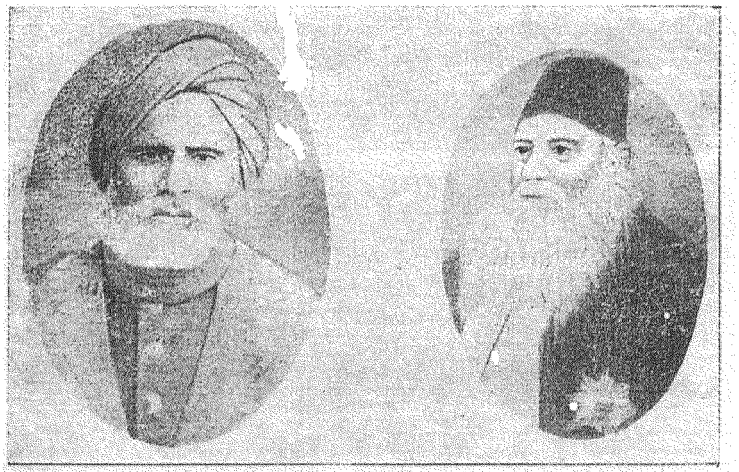

جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامہ مع ایک جلد مسدس پہنچا
جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم
ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی — اگر اس مسدس کی بدولت فن
شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے — کس صفائی
اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے
کہ ایسا دلی مضمون جو مبالغہ جھوٹ تشبیہات دور از کار سے

سرسید احمد خان کا خط حالی کے نام

جناب مخدوم ومکرم من!

عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فن، شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دور از کار سے، جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اُس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ سجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے۔ یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں.....۔

آپ کے اس خیال کا کہ (کتاب کا) حق تصنیف (اشاعت) مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم

کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف، (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو ''تہذیب الاخلاق'' میں چھاپوں گا۔ میرے اُن استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار، سید احمد شملہ،

پارک ہوٹل، 10 جون 1879ء

☆.....☆.....☆

شجرہ

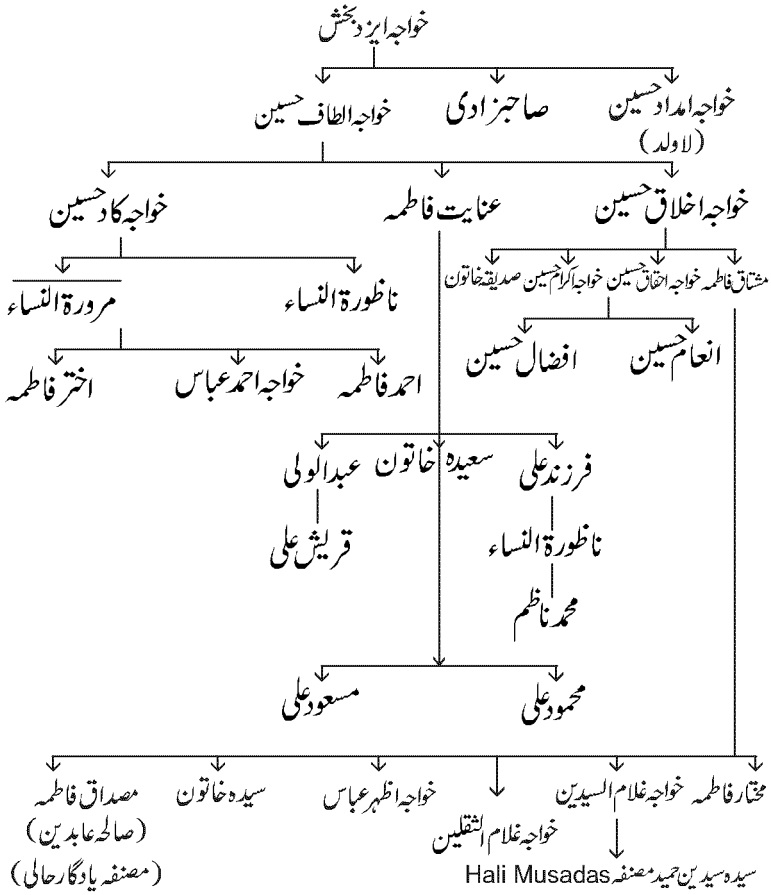

اس شجرے کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے دونوں بیٹوں خواجہ امداد حسین اور خواجہ سجاد حسین کی اولاد نے اُردو کو عمدہ ادیب نقاد افسانہ نگار اور ماہرین تعلیم دیے۔ خواجہ اخلاق حسین کے نواسے اور نواسی خواجہ غلام السیدین مصنف آندھی میں چراغ، صالحہ عابد حسین مصنفہ یادگار حالی، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید اور خواجہ سجاد حسین کی بیٹی کے بیٹے خواجہ احمد عباس ہماری ادعا کا ثبوت ہیں۔

(راست سے چپ)(کرسیوں پر) مولانا حالی، ڈپٹی نظیر احمد، محسن الملک، وقار الملک
(استادہ) تھامس آرنلڈ، شبلی نعمانی

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

(جونواب عماد الملک بہادر مولوی حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی)

میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں بمقام قصبہ پانی پت شاہ جہاں آباد سے جانب شمال 53 میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے؛ میں واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے؛ آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلہ نسب 26 واسطوں سے حضرت ابوایوب انصاری تک اور 18 واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور 10 واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو لقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چناں چہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص رخ بازار اور تولیت ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلّہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ کی

بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا ایک بزرگ سیّد جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناں شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا اُنہیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہّل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت

کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر 1855ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1857ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بے کاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروع اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہوا جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا ادبی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے

گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی وتعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں مسرتؔی اور اردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ واقع ہوا تھا۔انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا۔مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جواب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ واصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا: ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص مذاق پیدا ہوگیا۔

نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام

فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں رہ کر فیل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی 1874ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر۔ تیسری رحم وانصاف پر اور چوتھی حُبِّ وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی؛ لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وتنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چناں چہ میں نے اوّل مسدس مدو جزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں؛ لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً 1867ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا؛ لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا چناں چہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدیؔ شیرازی کی لائف اور ان کی نظم ونثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا

جس کا نام حیاتِ سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم ونثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرائمر وغیرہ میں نے لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب اخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم ونثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے 1898ء میں لکھا تھا اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

1305ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امدادِ مصنفین ایک وظیفہ تعداد پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور 1309ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکہ حال کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے نیا اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

دیباچہ

مسدس مدوجزر اسلام

1296ھ مطابق 1879ء

(مولانا حالی)

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تونے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے، ایک ایسے دل چسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے، نہ خاردار جھاڑیاں تھیں، نہ آندھیوں کے طوفان تھے، نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔

جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوش نما پودوں پر سانپ اور بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جوں ہی اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ اور مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی، خود آرائی کا خیال آیا، نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزا چکھا:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں

کی وہ خاک اڑائی کہ قیس وفرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ وفغاں کے شور سے کرّ وبیاں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھر مار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا اُمڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا، بہشت ودوزخ کی سیر کی، بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خُم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بے زار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کسیں۔ واعظوں کا خاکہ اُڑایا۔ دیر اور بت خانے کی تعظیم کی، کعبہ اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیے۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے، ہر چوب خشک میں عصاے موسوی کے کرشمے دکھائے، ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا، ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوں کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی:

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود
تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں:

شکست رنگ شباب و ہنوز رعنائی

دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں حدود رہی ہو، ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردید میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ آفتاں وخیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں، دم جڑھ رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ لیکن وہ اُولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے، اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اُسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جوادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ، اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے۔ نہ یہ خبر ہے کہاں جاتے ہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں۔ نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے، نہ عزم ہے، نہ استقلال ہے، نہ صدق ہے، نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا، مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے

بخارات دورنی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔قوم کے ایک سچے خیرخواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پر زور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
ور جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔تعصب کی گھنگور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہ ہیں۔علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا، مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے:

در فیض ست منشیں از کشائش نا اُمید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

((وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ .)) ''اور وہ

ایسا خدا ہے کہ جب لوگ نا اُمید ہو جاتے ہیں تو مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے۔'' ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل سے ہی نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑہی میں ایک اُبال آیا۔ افسردہ دل، بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنہی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی۔ بارے الحمدللہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک اُمید کے سہارے پر یہ راہِ دور دراز طے ہوگئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے اور نہ آیندہ ملنے کی توقع ہے:

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

اس مسدس کے آغاز میں پان سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اُس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمی ﷺ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جاں کاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے مگر شکر ہے کہ جس قدر ہو گیا اتنی بھی اُمید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے، کیوں کہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اُس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگیں بیانی۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل

وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ "لاعین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علٰی قلب بشر" (نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں گزرا) گویا اہل دہلی ولکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

☆.....☆.....☆

دیباچہ

متعلق بہ ضمیمہ مسدس مدوجزر اسلام

1303ھ مطابق 1886ء

(مولانا حالی)

حدیث درد دلاویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

''مسدس مدوجزر اسلام'' اول ہی اول 1296ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتد بہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت وشہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقعہ تعجب انگیز ہے۔ نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن وملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی برائیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ وسنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار واخیار مذہبی سوئے ظن رکھتے تھے۔ تعصب عموماً کلمہ حق سننے سے مانع تھا، بایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف وجوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ اکثر اخباروں میں موافق ومخالف ریویو اس پر لکھے گئے ہیں۔ شمال مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے، مگر اس پر مصنف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے۔ اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی

ایسی ہزار نظمیں بے کار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔ اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گم راہ نہیں ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ وراست نگراں ہیں۔ ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے۔ ان کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے۔ ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے مگر زائل نہیں ہوئے۔ ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں۔ ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی۔ ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔

یہ نظم جس میں قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچنا مدنظر تھا، اگرچہ مشرق کی عام نظموں کی بہ نسبت مبالغے سے خالی تھی لیکن فروگذاشت سے خالی نہ تھی۔ دوست کی نگاہ نکتہ چینی اور خوردہ گیری میں وہی کام کرتی ہے جو دشمن کی نگاہ کرتی ہے۔ دونوں یکساں عیبوں پر خوردہ گیری اور چشم پوشی کرتے ہیں مگر دشمن اس غرض سے کہ عیب ظاہر ہوں اور خوبیاں مخفی رہیں اور دوست اس خوف سے کہ مبادا خوبیوں کا غرور عیبوں کی اصلاح سے باز رکھے۔ مصنف بھی جو کہ دوستی کا دم بھرتا ہے، شاید محبت اور دل سوزی ہی سے قوم کی عیب جوئی پر مجبور ہوا اور ہنر گستری سے معذور رہا۔ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں۔ شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہو سکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی۔ گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہیے۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔ ضمیمے کو طول دینا مصنف کا مقصود نہ تھا لیکن اس مضمون کو چھیڑ کر طول سے بچنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے سمندر میں کود کر ہاتھ پاؤں نہ مارنا۔

قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے۔ شاید بعض تصرفات کو ناظرین اس وجہ سے

کہ قدیم اسلوب مانوس ہو گیا تھا، پسند نہ کریں۔ مگر مصنف کا فرض تھا کہ دوستوں کی ضیافت میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کرے جو خود اس کے مذاق میں ناگوار معلوم ہو۔ نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے۔ مگر الحمدللہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

☆.....☆.....☆

حالی کی حیات اور شخصیت

نام:

خواجہ الطاف حسین

تخلص:

حالؔی۔(بعض افراد نے لکھا کہ آغاز شاعری میں حالؔی خستہ تخلص کرتے تھے جو صحیح نہیں)

تاریخ ولادت:

بقول حالؔی ''میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں ہوئی۔'' (1253 ہجری سال اپریل 1837ء سے شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ حالؔی اپریل اور دسمبر 1837ء کے درمیان پیدا ہوئے)۔

نوٹ: .....تذکرۂ حالی میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی تاریخ ولادت 1253ھ مطابق 1836ء لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

مقام ولادت:

پانی پت ضلع کرنال۔

والد:

خواجہ ایزد بخش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انگریز سرکار کے پرمٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اس وقت حالؔی صرف نو سال کے تھے۔

والدہ:

حالؔی بچپن ہی سے والدہ کی توجہ تربیت اور محبت سے محروم رہے حالؔی کی ولادت کے فوری بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا چناں چہ ان کی تربیت اور پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

دادا:

خواجہ بوعلی بخش۔

پردادا:

خواجہ محمد بخش۔

جد:

خواجہ ملک علی جواہرات کے بادشاہ میرک علی کے بیٹے تھے اور غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں ہندوستان آئے۔ بلبن نے ان کے علم و فضل و کمال سے متاثر ہو کر کرنال کے قصبہ پانی پت میں جاگیر عطا کی اور یہ خاندان 1276 ہجری سے پانی پت میں مقیم ہو گیا۔

خاندان:

حالؔی کا شجرہ دادھیال سے بیالیسویں پشت میں حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے اور نانھیال سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرم ﷺ سے جا ملتا ہے اِسی بنا پر صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ حالی کی ماں سیدانی تھی۔ حالؔی لکھتے ہیں میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ بیٹی تھیں۔

بھائی بہن:

حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجہہ النساء تھیں۔ چونکہ حالی سب سے چھوٹے تھے اور ان کی ماں ذہنی توازن کھو چکی تھیں اس لیے بڑے بھائی اور دونوں بڑی بہنوں نے حالی کی تربیت اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ بقول حالؔی: ''میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔''

تعلیم:

(ا) بقول حالؔی: ''میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔''

صالحہ عابد حسین ''یادگار حالی'' میں لکھتی ہیں۔ ''پرانے زمانے کے دستور کے موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ

ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ اُن کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چناں چہ انہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔

(ب) سید جعفر علی سے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے حالؔی نے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے دلچسپی ہوگئی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حالؔی کے مزاج میں جو فطری شاعری کی اپج تھی اُسے ابھرنے کا موقع بھی ملا۔

(ج) حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف ونحو پڑھی جو لکھنو سے تحصیل علم کے بعد پانی پت میں مقیم تھے۔

(د) دلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولوی نوازش علی سے کچھ کتابیں صرف ونحو اور منطق کی پڑھیں۔

دلی ہی میں شرح سلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنا شروع کیا۔

(ھ) دلی میں ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہوئے اور مولوی عبدالرحمان، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی سے بغیر کسی خاص ترتیب اور نظام کے منطق، فلسفہ کبھی حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر (17) برس کی تھی۔ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1858ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا تو میں پانی پت واپس چلا

آیا اور قریب چار برس کے بے کاری کی حالت میں گزرے۔ یہاں علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔

دلی کالج سے بے زاری:

جس وقت حالی دلّی گئے اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا لیکن اس ڈیڑھ سال کی مدت میں حالؔی نے کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کالج کے طلبا سے ملاقات کی جن میں محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ڈپٹی نظیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ جیسے طالب علم موجود تھے جس کی وجہ سے حالؔی کا پانی پت کا ماحول اور ان کی محدود سوسائٹی تھی جہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر ہی منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کو صرف سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے یہ افراد انگریزی مدرسوں کو جاہلوں کے مدرسے یا مچھلے کہتے تھے۔

تلاش علم:

صالحہ عابد حسین کہتی ہیں: ''حالؔی کی شادی تو ہوگئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اُس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ دلّی جا کر جو اس اجڑی حالت میں علوم وفنون کا مرکز تھی؛ تحصیل علم کریں۔ دلّی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل ہی ہے۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے انہیں دلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پا پیادہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں کچھ مسافت طے کی ہو۔ علم کا یہ سچا شیدائی جب دلی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔''

سچ بات یہ بھی ہے کہ ہم صرف سکّے کے ایک رخ یعنی علم کی طلب اور اس کے حاصل کرنے کی قربانیوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن سکّے کے دوسرے رخ پر ایک تازہ شادی شدہ دلہن کے

احساسات جذبات اور دنیا بھر کے تشویش ناک خیالات کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے؟ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ حالؔی اپنے اس عمل سے شرمندہ تھے جس کا نتیجہ ان کی تخلیقات میں آگے چل کر عورتوں کی کسمپرسی اور حقوق پر بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد جیسی نظمیں اور ساری عمر اپنی بیوی کی تعریف اور توقیر رہی ہو۔

شریکِ حیات:

بقول حالؔی: ''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہّل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ (17) برس کی تھی۔''

خواجہ امداد حسین نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی۔ صالحہ عابد حسین نے جو خود حالؔی کے خاندان کی فرد ہیں خاندان کے بزرگوں کے بیانات اور خواجہ غلام السبطین مرحوم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے حالی اور ان کی بیوی کے حالات یادگار حالی میں جمع کیے ہیں۔ ہم کچھ مستند واقعات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ دونوں کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اور انہی واقعات سے حالؔی کے معاملات کی صفائی بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ حالی حقوق نسواں کے حامی تھے اور یہ حمایت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

بی اسلام النساء بڑی با سلیقہ، منظّم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالؔی کی اور اُن کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اِس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

واقعہ:

خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالؔی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالؔی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حالؔی

سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر بُرا بھلا کہا کہ نبی ﷺ کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالؔی نے صرف اتنا کہا: ''سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔''

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالؔی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے۔ ''بس بی بس.....اب تو شام بھی ہوگئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔''

کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آ کر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جَو بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے،

اُن میں حالؔی کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالؔی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

حالؔی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالؔی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انہوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ ''اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہوسکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''تمہاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔''

تمہاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔ 1900ء میں بی اسلام النساء کا ہیضے سے انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالؔی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہ رَاجِعُون۔ اگرچہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت مند

اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خوان اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انہوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے وِردِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہو سکتا ہے۔''

حالؔی کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج و غم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اُس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالؔی کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالؔی کے دل میں اُن کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ حالؔی کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ''تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا ورد رکھو۔ ''الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے۔'' خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا بہترین علاج ہے۔''

اولادیں:

حالؔی کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے۔ تین بچے جن میں اعتقاد حسین اور رقیہ بیگم شامل تھیں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہے۔

(ا) خواجہ اخلاق حسین، پیدائش قبل از: 1857ء۔ وفات: 2/فروری 1924ء

(ب) عنایت فاطمہ، پیدائش: 1859ء۔ وفات: 1915ء

(ج) خواجہ سجاد حسین، پیدائش: 1861ء۔ وفات: جولائی 1946ء

خواجہ اخلاق حسین کو حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے گود لے لیا تھا اسی لیے حالؔی ان کو برادر زادہ کہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مشتاق فاطمہ تھیں جن کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔ اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے۔ دو بیٹے خواجہ احقاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور چھوٹی بیٹی صدیقۃ النساء اخلاق حسین کی آخری اولاد تھی۔

خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اُردو شعر و ادب کی شمع جلائی رکھی ہے اور اس کی روشنی آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ محترمہ سیدہ سیدین اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق اسی خاندان سے ہے حالؔی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم تھیں۔

حالؔی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی اپنی گھریلو زندگی سے پریشان رہتے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے داماد خواجہ عبدالعلی کچھ محنتی آدمی نہ تھے وہ ہمیشہ مختلف شہروں میں معمولی جگہ پر ملازم تھے اور اپنی بیوی بچوں سے لاپروا اور بیگانہ تھے اور ان کے خاندان کا سارا بوجھ حالؔی پر تھا۔ دوسری اہم وجہ حالؔی کے نواسے عبدالولی کو مرگی کی بیماری تھی جس نے حالؔی کا سکون چھین لیا تھا۔ حالؔی کی حالت ان کے ایک خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھا تھا۔ ''عبدالولی جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہوگیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''

حالؔی ذہنی اور مالی طور پر بہت پریشان تھے اور آخری عمر میں کسی سکون کے مقام کی تلاش میں تھے تاکہ اپنی نظم اور نثر کی تحریروں کو ترتیب دے سکیں لیکن انہیں اس کی فرصت نہ تھی۔ حالؔی نے اپنے نواسے کی بیماری پر ہزاروں روپیہ صرف کیا لیکن افاقہ نہ ہوا نواسے کا مزاج جنون کی کیفیت اختیار کرتا گیا اور بعض اوقات وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ چناں چہ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انہیں شدید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حالؔی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور جب تک خواجہ سجاد حسین نے بھانجے کو منا نہیں لیا حالؔی نے اپنے لائق بیٹے سے بات چیت نہیں کی۔ وہ اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذرا سی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حالؔی کے دوسرے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالؔی کی تصانیف کی اشاعت کا بندوبست کیا۔

چناں چہ حالؔی کی تصنیف مولود شریف کی پشت پر خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے: ''ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا حالؔی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم و مغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالؔی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے۔''

حالؔی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کا شمار اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے تعلیم یافتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ خواجہ سجاد حسین کی کاوشوں سے بہت سے اہم مسودے حالی کی تصانیف کے محفوظ ہو گئے اور شائع ہو کر عوام کی دسترس میں آئے۔

حالؔی اور فیملی:

حالؔی صحیح معنی میں کنبہ پرور تھے۔ وہ صرف اپنے بیمار نواسے کی بیماری سے متفکر نہ تھے بلکہ اپنے دوسرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں سے بھی پوری طرح پیار و محبت کرتے تھے اور انہیں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی صحت، تعلیم اور جذبات کا خیال رہتا ذیل کے چند واقعات ہماری بات کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ حالؔی ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تا کہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں: ''میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا طمینان رہے۔''

☆ خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں

سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو اُن کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالؔی نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انہیں ایف۔ اے کے بعد انجینئرنگ میں بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ: ''دیکھو مولانا حالؔی کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔''

☆ مولانا حالؔی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ احقاق حسین اور خواجہ اکرم حسین کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالؔی ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حقن (احقاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔ مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے اور روز بروز غریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا۔ جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا..... اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔''

☆ رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔ اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ہی کس دل سوزی سے لکھتے ہیں: ''طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج و ملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت و نفرین سے احتراز کرنا چاہیے..... کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ ان شاءاللہ ضرور کامیاب ہو گے۔''

☆ خواجہ غلام السیدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھہرا کرتی

تھیں۔اوپر دیوان خانے میں مولانا حالؔی رہتے تھے۔سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے ''بابا'' اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔سیدین پھر پکارتے ''بابا'' اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انہیں ''بابا'' کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔

☆ سیدین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی اور مولانا حالؔی اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔انہوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے:

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے صورت اچھی ، سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔وہاں یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے:

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقین نہیں کرتی دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور

اوپری شکل سے ہے گھبراتی ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزیدار لاگ ہوتی ہے۔اُس کا ذکر دیکھیے:

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹی ہے دوڑ کر ماں سے بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں:

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زبان جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں
پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کررہا ہے۔

☆ حالؔی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اگرچہ وہ خاندانی رشتہ دار ہو یا ہمسایہ یا بیگانہ یہ فرشتہ صفت انسان کے درجنوں واقعات آج ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی دل کو تڑپا دیتے ہیں اور ان کے اخلاق کا کلمہ پڑھوا دیتے ہیں۔

پانی پت میں ایک مرتبہ حالؔی کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا چلّا رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کررہے تھے مگر کوئی اُسے اٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھہرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا: ''جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔'' یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اخلاق و کردار:

یہ سچ ہے کہ حالؔی کے اخلاق اور کردار کا کلمہ دوست دشمن سب نے پڑھا ہے۔ حالؔی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ عملاً میر انیسؔ کے شعر کے مصداق تھے۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حالؔی معمولی سے معمولی شخص کی عزت اور شخصیت کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا دشنام دینا، کوسنا، غصہ کرنا، دھتکارنا وغیرہ تو ایک طرف کبھی کسی سے آواز بلند گفت گو نہ کی۔

حالؔی بچوں میں بچے، بیماریوں میں مسیحا، دردمندوں کے ہمدرد، غریبوں کے مددگار اور حاجت مندوں کے سہارا تھے۔ اگرچہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن ان کا دل کشادہ تھا کیوں کہ ان کی فطرت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کہتے ہیں:

ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

انگریزی محاورہ ہے۔ It is Difficult to be humble when you are great. مگر حالی نے اپنے کردار اور عجز وانکسار سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم شخص وہی ہے جس کے اخلاق اور کردار بلند ہوں۔ چونکہ اُردو ادب میں یہ گوہر نایاب خاص طور پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں میں خال خال ہے اِس لیے ہم چند معتبر اور مستند واقعات جو حالؔی کی فرشتہ صفت شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

شاعروں کی چشمک اور معرکہ آرائیوں سے اُردو کے قارئین بے خبر نہیں ہیں۔ تعلّی شاعر کا پیدائشی حق تو ہے لیکن مشاعروں کی سیاسی تجلی اور بازی گری نے ادبی اور شعری آموزش گاہ کو شعرا کا دنگل بنا دیا ہے اس ماحول میں حالی کی سیرت کو دیکھیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالؔی مرحوم اور داغؔ مرحوم دونوں شریک ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ ''خبر کہاں''، ''نظر کہاں''، داغ مرحوم کی غزل مشہور ہے:

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغؔ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور اُنہوں نے اپنی غزل سنائی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
حالؔی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اَب — آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح وتحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا۔ خود داغؔ نے کہا۔ ''اس غزل

کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔''

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اَب میں ہر چند اصرار کر کے پوچھتا ہوں، فرمایئے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ''جی ہاں! بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہو گیا۔'' میں نے بار بار پوچھا: آپ کی غزل پر داغؔ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن ''جی ہاں، کیا کہا جائے۔'' کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا ''جی ہاں'' کی ''ہآں'' کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے، اُسے قید کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ ''جی ہاں'' کی ''ہآں'' پر ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

حالؔی کے پڑپوتے خواجہ غلام الحسنین اپنے مضمون ''حالؔی'' میں لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیض یاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگرچہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سررشتہ تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابت قریبہ حاصل تھی اس لیے کسی وقت بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لیے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں، یا باہر مردانہ مکان میں۔ اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل، المختصر ان کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سنی سنائی پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالؔی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالؔی کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتاپا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے۔ لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالؔی کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پُر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔''

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر جو 31/دسمبر 1914ء کو واقع ہوئی، اپنے اخبار ''عصر جدید'' میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

''مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محبّ اہل بیت اور صوفی منش سنی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقِ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے

ساتھ رحم ومروّت۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہوسکتا ہے کہ ایسا انسانِ کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔ خدمت گار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔''

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے درد دل یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں، سیرت میں ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

نواب عماد الملک کہتے تھے سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے حالی کا مرتبہ بہت بلند تھا اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔

حالی ہر چھوٹے اور بڑے سے خلوص اور محبت سے ملتے تھے وہ بڑوں اور چھوٹوں کا ادب کرتے تھے علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں جب عبدالحق اور حمید الدین حالی سے ملنے گئے تو وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حمید الدین نے کہا کہ آپ تعظیم کر کے ہمیں شرمندہ کرتے ہیں تو کہنے لگے: ''آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی تعظیم کروں۔ آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔''

اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔ رفتار و گفتار، رہن سہن ملنے ملانے میں اتنی سادگی اور خاکساری تھی کہ ملنے والے کو مشکل سے یقین ہوتا کہ یہ اُردو کا عظیم شاعر و ادیب حالؔی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالؔی نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر عمدہ ریویو کیے انہیں سراہا لیکن اُنہی ہم عصروں نے سوائے سرسید کے حالی کی تصانیف پر خاموشی اختیار کی جس کا حالی نے کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کی حمایت میں کہتے اور لکھتے رہے۔

مولوی ظفر علی خان نے ''دکن ریویو'' میں شبلی کی کتاب پر بے جا شوخی سے کام لیا تو حالؔی نے محبت بھرے جملوں سے نصیحت کرنی شروع کر دی۔ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

1903ء میں جب مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اُردوئے معلیٰ'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اِس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ 'اردوئے معلیٰ'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالؔی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرتؔ کو دیکھا۔ اِن مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور ''اردوئے معلیٰ'' کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالؔی کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اُردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور ''واہ! خوب لکھا'' کہہ کر داد دیتے تھے حالؔی بھی ''ہوں ہاں'' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرتؔ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھیے

آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اِس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالؔی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالؔی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا کہ حالؔی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

حالؔی کے اخلاق اور کردار کے جو دوست اور دشمن مداح تھے وہ ان کی انسانیت تھی۔ افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انسانیت کے جوہر کی کمی دیکھی گئی ہے۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ثقافتی تہذیب کے نمایاں شخص عماد الملک سید حسین بلگرامی جو سرسید کے قریبی دوست بھی تھے کہتے تھے، سرسید احمد خان کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔

حالؔی نے خود انسانیت کی تعریف سرسید احمد خان کے فارسی مرثیے میں کی ہے جو سچ کہیں تو حالؔی ہی پر صادق آتی ہے۔

چیست انسانی! تپیدن از تپ ھمسایگان
از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

(انسانیت کیا ہے! ہمسایوں کے رنج اور زحمت سے رنجیدہ رہنا۔ جنت میں بھی نجد کی گرم و زہریلی ہوا کے احساس سے افسردہ اور مرجھائے ہوئے رہنا)

خوار دیدن کویش را از خواری ابنائے جنس
درشبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

(اپنے کو تمام کم ترینوں سے کم تر سمجھنا اور قفس کی تکلیف دہ زندگی کے احساس سے محل میں بھی بے چین رہنا)

آتش قحطی کہ در کنعان بسوزد باغ و کشت
برفراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

(وہ قحط کی آگ جس سے مصر کے باغ اور کھیت جل چکے اس کی گرمی اور جلن سے تخت شاہی مصر پر بھی بھن جانا)

بی مڑیا کی نگہداشت:

حالؔی ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ غدر میں دلی اجڑی اور کئی شریف خاندانوں کی عورتیں پانی پت کے گردونواح میں عزت و جان بچانے کے لیے زندگی بسر کرنے لگیں۔ ان ستم زدہ بدبخت افراد میں بی مڑیا بھی شامل تھی جنہوں نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر حالؔی کے کنبے کے ساتھ گزار دی۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں کہ ایک اسّی (80) سالہ بوڑھی بی مڑیا کو خود انہوں نے دیکھا تھا جو غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ شوہر، ماں باپ عزیز و اقارب سب مارے گئے اور اس اکیلی کم سن لڑکی نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر چھوٹے موٹے کام جیسے سلائی، کشیدے کاری وغیرہ کر کے اپنا خرچ چلاتی رہیں اور عزت و خودداری سے زندگی گزار دی۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے بی مڑیا کی اس طرح خدمت کی جیسے ایک بیٹی اپنی ماں کی خدمت کرتی ہے۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی صرف جذباتی شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر جس قدر بھی ہو سکے عورتوں کے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے۔

نوکروں سے برتاؤ:

حالؔی کے دو خاص ملازم تھے۔ نانوں خان اور عطاء اللہ۔

حالؔی ان دونوں ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار نانوں خان جب سجاد حسین کے ساتھ دوسرے شہر جاتا تو اس کی نگہداری کی تاکید کرتے اور نانوں خان کو خط لکھنے کی تاکید بھی کرتے۔ ایک مرتبہ نانوں خاں غلطی سے کروسین تیل گھی سمجھ کر پی گیا۔ حالؔی نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور نواب لوہارو کے ہاں کی دعوت کو جانا ملتوی کر دیا۔ عطاء اللہ مزاج کا سخت اور بہت اونچا سنتا تھا لیکن وہ بھی حالؔی کا چہیتا تھا جس کو حالی اپنی جا کٹ رضائی اور کھانے پینے کی اشیا دیتے رہتے تھے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد یہ دونوں ملازمین دن رات ان کے گن گاتے رہتے تھے۔

مولانا روم نے بہت صحیح انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔

دل بدست آرد کہ حج اکبر است
از ھزاراں کعبہ یک دل بہتر است

مذہب:

حالؔی کی پڑپوتی صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں۔ حالؔی عقیدتاً حنفی سنی مسلمان تھے اور حالؔی کی بیوی شیعہ تھی۔ وہ حنفی المذہب سنی تھے لیکن اہل بیت اطہار سے اور جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے انہیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعر اس احترام اور عقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے ؎

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے وہ تیری محبت تری عزت کی وِلا ہے

پانی پت میں صرف اُن کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ اُن کے مذہبی عقیدے کی بھی اُسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالؔی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالؔی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حالؔی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اُس شعر سے مل سکتا ہے جو انہوں نے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ ''مسدس حالؔی'' کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

قناعت:

قناعت ایک خداداد انسانی قدر ہے جسے انسان اپنے نفس کی پاکیزگی سے نمود دیتا ہے

میر انیسؔ نے کہا تھا ؎

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انسان کو جینے کے لیے معاش اور روزگار کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی کا ایندھن یہی روپیہ اور مال ہے جس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور بدن کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ حالؔی کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اوائل زندگی سے آخری عمر تک کبھی حریص وطمع نہیں کیا بلکہ قانع رہے جو کچھ بھی انہیں روزگار نے فراہم کیا۔ انیسؔ کا شعر حالؔی کی وضع داری اور قناعت پر صادق ہوتا ہے: ؎

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

واقعہ:

جب حیدر آباد کے نواب سر آسمان جاہ نے حالؔی کی شعری اور ادبی کاوشوں سے متاثر ہو کر انہیں ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے پوچھا آپ کو گذر بسر کرنے کے لیے کتنا وظیفہ چاہیے۔ حالؔی نے جواب دیا۔ مجھے اینگلو عربک اسکول سے جو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں تو حیدر آباد کے سکہ رائج الوقت کے پچھتر روپے ہوتے ہیں یہی میری زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆ لاہور کے قیام کے دوران ڈاکٹر لٹز کی ارضیات پر کتاب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو بعد میں گورنمنٹ کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ حالؔی نے اس ترجمہ اور کتاب کو کالج کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی لاہور میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور تھے اور خاندان کی ساری ذمہ داریاں حالؔی پر تھیں۔

☆ حالؔی نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سوائے ایک آدھ کتاب کی رجسٹری یا حقوق محفوظ کروائے ہوں گے ان کی تمام تر کتابیں پبلشرز جب چاہتے شائع کر کے فائدہ اٹھا لیتے۔ مسدس حالؔی کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے لیکن حالی کو کوڑی بھی نہیں ملی شاید اُردو ادب میں اس قسم کے استحصال کی دوسری مثال نہ ہو۔

☆ حالؔی نے اپنی تمام تر زندگی ایک معمولی مکان میں گزار دی۔ آخری عمر میں چھوٹے بیٹے سجاد حسین جو گورنمنٹ کے بڑے عہدے پر فائز تھے ایک قطعہ زمین لے کر نسبتاً آرام دہ گھر بنایا جس کے اوپری حصے میں حالؔی رہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالؔی کے ہمدرد عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وقار الامرا نے حیدرآباد میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان محل فلک نما بنوایا تھا جس کا ذکر حالؔی نے اپنی نظم میں بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے حالؔی کا یہ مکان دیکھا ہے جس کے مالک اُس وقت ایک سردار صاحب تھے۔ ہمیں پتا نہیں اس عظیم شخص نے جس گھر میں پچیس برس گزارے ہوں وہ اب کس حالت اور کس کی تحویل میں ہے۔ کیا عمدہ ہوتا اگر اس گھر کو حالی میوزیم میں تبدیل کر کے ان کے نادرات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا۔

☆ حالؔی کی مالی حالت خستہ اور کمزور ہونے کی وجہ سے بہت سے کام وہ اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔

(ا) حالؔی دلّی میں ایک مطبع کھولنا چاہتے تھے تاکہ فارسی عربی اور اُردو کی عمدہ نایاب اور کم یاب کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کر سکیں لیکن پیسہ نہ ہونے سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر رہا۔

(ب) حالؔی ایک عمدہ میگزین نکالنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی مالی مشکلات نے انجام ہونے نہ دیا۔

(ج) حالؔی اپنی تصانیف بھی اچھی طرح سے شائع نہ کر پائے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس قائم کر کے حالؔی کی کتابوں کو شائع کیا۔

☆ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے اقربا رشتہ دار اور غریبوں میں صرف کر دیتے تھے۔ جب کبھی کسی شہر جاتے وہاں سے تحفے سوغات خصوصاً

خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ضرور لاتے۔ یادگار حالؔی میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

☆ حالؔی کے ملازم عطاء اللہ کے واقعات میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی میں لکھا ہے کہ حالؔی اپنے بنوائے کپڑے عطاء اللہ کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں جب عطاء اللہ نے حالی سے کہا کہ رات کو بڑی سردی لگتی تو حالؔی نے اپنی نئی بنوائی ہوئی رضائی عطاء اللہ کو دے دی جب اُس نے کہا کہ یہ تو آپ نے کل ہی بنوائی ہے کوئی پرانی رضائی دے دیجئے تب حالؔی نے کہا یہ تم لے لو ہم اور بنوالیں گے۔

مسافرت:

حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ تقریباً زندگی کا ایک چوتھائی حصہ مختلف شہروں میں گزرا۔ زندگی کا پہلا سفر پانی پت سے دلّی کا پیدل کیا جو حصول علم کا آغاز تھا اور آخری سفر فرید آباد کا تھا جو ان کی تخلیقات کی جمع آوری کا تکملہ تھا۔ حالؔی سات سال جہانگیر آباد، چار سال لاہور اور کئی سال دہلی میں اور متعدد بار مقیم رہے۔ علی گڑھ حیدر آباد کراچی الٰہ آباد بھوپال آگرہ بمبئی کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ مقامات پر جاتے آتے رہے۔ صحت کی کمزوری، سفر کی تکالیف ان کے مقاصد میں حائل نہ ہوسکیں۔

شمس العلماء کا خطاب:

حالؔی کو جون 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ حالؔی کو 1875ء میں ان کی تصنیف مجالس النساء پر چار سو روپے کا انعام دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں تیس سال کا فرق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تحریر کہ شمس العلماء کا خطاب اور انعام حالؔی کو جون 1904ء میں پیش کیا گیا صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ حالؔی کو شمس العلماء کا خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔''

حالؔی اگرچہ اس خطاب کے بہت پہلے ہی سے حق دار تھے لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ خطاب انہیں عمر کے آخری حصے میں نصیب ہوا۔ حالؔی کو جب یہ خطاب ملا تو وہ فکر مند اور نگران بھی رہے چناں چہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

''خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت

ڈائریکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائریکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی تصدق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیوں کہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔.....اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضروری تحریک کی تھی۔ مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگر چہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسب تحریر برخوردار تصدیق حسین کے گیا تھا وہ چوں کہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہو گی۔ چناں چہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل اُن کے ملنے کو جاؤں گا۔ انہوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی اِدھر سے اُدھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارتِ قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟''

پوشاک:

حالؔی کے بیٹے سجاد حسین کہتے ہیں۔ حالؔی کی پسند نفیس تھی۔ کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر

کے رنگ ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہننا پسند کرتے تھے چونکہ سودیشی کے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی باریک کھدر مل جاتی تو اس کے کپڑے پہن کر خوش ہوتے۔

عام طور سے کرتا پاجامہ اور اچکن پر سردیوں میں چوغہ یا روئی کا دگلہ پہن لیتے گلے میں مفلر اور سر پر گول سی ٹوپی بھی پہن لیتے۔

خوراک:

حالؔی کی خوراک کم اور سادہ تھی۔ ترکاریاں بہت پسند تھیں۔ پھلوں میں آم اور خربوزوں کے عاشق تھے۔ آم کی شناخت تھی اور اچھے آم خریدتے تھے۔ چائے اور بسکٹ ہمیشہ تیار رکھتے۔ پان تمباکو اور افیون کی گولیاں کھاتے حقے کا استعمال بھی ہر روز کرتے رہتے۔ آخری عمر میں دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے پان کھانے میں کمی کر دی تھی۔

خوراک میں انتخاب اور اعتدال تھا جو آخری عمر تک برقرار رہا۔

آغاز شاعری:

ہمیں تحقیق اور تلاش کے باوجود یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حالؔی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالؔی فطری شاعر تھے چناں چہ دہلی جانے سے پہلے ہی یہ شاعری کا پودا ان کے دل و دماغ میں نشو و نما پانے لگا جس کا ایک سبب پانی پت میں موجود حالؔی کے استاد سید جعفر علی تھے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے جن سے فارسی لٹریچر کی کتابیں پڑھی تھیں اس وقت حالی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ اس کی دوسری وجوہات میں حالی کا حافظہ، گیرائی اور مشاہدے کی گہرائی کے علاوہ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دوچار ہونے کے سبب دل و دماغ کا سوز و گداز بھی تھا۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حالؔی جب پہلی بار ڈیڑھ سال دلی میں رہے اس وقت ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے غالباً دوسری بار جب 1861ء میں ملازمت کی تلاش میں دلی آئے تو شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ دہلی میں محمد اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ ادبی

مرکز بنا ہوا تھا جہاں شعر وسخن کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ حالؔی بھی شریک بزم رہتے۔ حالؔی اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

حالؔی کی اس تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تئیس (23) چوبیس (24) برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ غالبؔ کی نصیحت نے حالؔی کو پابند مشق سخن کر دیا اور وہ ہمیشہ فکر شعر گوئی میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ دلّی کے ماحول سے متاثر رہ کر عشقیہ شعر کہتے اور عاشقانہ اشعار پسند کرتے تھے۔

پڑھنے کا انداز:

حالؔی کے شعر پڑھنے کا انداز فطری اور پر تاثیر تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔ مولوی عبدالحق نے انہیں کئی جگہ پڑھتے سنا تھا چناں چہ اپنی کتاب ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں: آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور

پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

شیفتہ کی مصاحبت:

حالی کی زندگی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صحبت غالب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے قلم سے اپنی کہانی میں لکھا ہے۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلّص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔ ع

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

حالیؔ کی تحریر سے شیفتہ سے تعلقات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی راستے سے حالیؔ کو غالبؔ کی منزل ملی اور غالب نے حالیؔ کی شعری اور فکری دنیا میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک خستہ شاعر کو خالی سے حالی بنا دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ جو حالیؔ کی نصیحت کے جواب میں لکھا گیا اس کا مخاطب مصطفیٰ خان شیفتہ ہی ہے۔

تو ای شیفتہ و حسرتی لقب داری ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالیؔ از من آشفتہ بی سبب رنجید تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکی ادائے عبادت عمر پیشینہ دگر بہ پیش گاہی حالی اعتذار کنم

یعنی تو جو شیفتہ اور حسرتی لقب رکھتا ہے میں صرف تیری محبت اور لطف پر بھروسہ رکھتا ہوں حالیؔ مجھ سے خفا اور بغیر کسی وجہ کے رنجیدہ ہے اگر تو سفارش نہ کرے تو کہہ میں کیا کروں۔ اگر دوبارہ مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جائے تو میں صرف دو کام کروں گا ایک گذشتہ عمر کی عبادت جو میں نے نہیں کی اور دوسرے حالیؔ سے معذرت خواہی۔

حالیؔ کی ملاقات شیفتہ سے دلّی میں ہوئی تھی اور پھر حالی جہانگیر آباد میں جو شیفتہ کی جاگیر تھی سات آٹھ سال مقیم رہے۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے لکھا ہے کہ شیفتہ نے اپنے چھوٹے بیٹے نقش بند خان کی اتالیقی کے لیے حالیؔ کا استخدام کیا جس کی شدت سے تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔ ''مالک رام صاحب نے حالیؔ کے بارے میں شیفتہ کی جو رائے نقل کی ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالیؔ سے ان کی عقیدت اور حالیؔ کے خاندان کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہیں..... مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالیؔ کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو اردو ادب میں حالیؔ کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالاں کہ حالیؔ یہ نہیں سوچتے تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش خان یا ان کے بچوں کے

اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب ہونا حالؔی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔''

راقم کی نظر میں مصاحب ہونا یا اتالیق ہونا شخصیت کے علم وفضل اور عمر کی نسبت سے ہوتے ہیں۔ حالؔی سات آٹھ سال جہانگیر آباد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے۔ مصاحبت ان دنوں کچھ شام کے گھنٹوں پر مبنی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی اپنی کہانی میں سات آٹھ جملوں میں شیفتہ کی مصاحبت کی سات آٹھ سالہ مصروفیات کو مکمل اور مستند طور پر بیان کر سکتے تھے ان دنوں کی گزارشات کو گھر کے افراد ہی بہتر بتا سکیں گے۔ صالحہ نے اپنے والدین سے جو سنا ہے ہم کو اُسے صحیح ماننا پڑے گا جب تک کہ کسی مستند حوالے سے اس کی تردید کی جا سکے۔ حالؔی بچپن سے ہی تعلیم کے شیدا تھے وہ ایک عمدہ معلم بھی تھے اور ساری عمر تعلیم اور علم کے فراہم کرنے میں صرف کر دی یہ تو شیفتہ کے لیے مایہ افتخار ہے کہ حالؔی جیسا عمدہ انسان ان کی صحبت میں رہا اور شیفتہ کے بچوں کے لیے باعث فخر کہ حالی ان کے اتالیق رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے حالؔی کی فکری اور شعری جہتوں کو مہمیز کیا۔ ان کی فکر سے مولویت کم کی اور وسعت نظری سے ہم کنار کیا۔ حالؔی مالی لحاظ سے آسودہ خیال رہے چناں چہ ان کے انتقال کے بعد پھر روزگار کی تلاش میں لاہور میں پناہ لی۔ شیفتہ ہی کے ذریعے غالب کے قریب پہنچے اور غالب کی مصاحبت اور استادی کے فیض سے مستفید ہوئے۔ غدر کے زمانے اور اس کے بعد بھی جہانگیر آباد نسبتاً ایک ایسا مقام تھا جہاں حالؔی اپنے فن اور شخصیت کو سنوار رہے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ حالؔی یادگارِ شیفتہ لکھ دیتے تا کہ ہمیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

بیماریاں:

حالؔی جوانی سے کئی امراض سے دو چار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا۔ چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی۔

☆ جوانی میں اسہال نے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اسی زمانے سے انہیں بواسیر کی بھی شکایت تھی۔

☆ نزلہ، کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائیٹس کے

سبب ہو۔حالؔی کے داہنے بازو میں فلشن کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔

☆ سوزش سینہ اور درد معدہ اور قلب کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔

☆ دانتوں کی تکلیف، مسوڑوں میں سوجھن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔

☆ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث ہوسکتی ہے۔

☆ سانس کی تنگی قلب کی نارسائی، کم خونی اور دمے کے باعث تھی۔

☆ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہوسکتی ہے۔

☆ حالی کی بینائی میں کمی رعشہ بھی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا۔موتیا اترنے یا Catract کے باعث تھی۔ چناں چہ انہوں نے دو مرحلوں میں پٹیالہ اور لکھنو کے سرجنوں سے عمل جراحی کروا کر عینک کے استعمال سے کسی حد تک اپنی بینائی کو برقرار رکھا جس کے سبب وہ اپنی تصنیف وتالیف کے علاوہ روزمرہ کے کام مکتوب نگاری وغیرہ خود انجام دیتے تھے۔

حالؔی نے اپنے خطوں میں اپنی صحت سے غفلت اور بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔حالؔی کی طبیعت میں جو کسی کام کرنے کی سچی لگن تھی وہ انہیں ان تمام مشکلات اور بیماریوں کے باوجود اُس کام کو بدرجہ احسن انجام دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

مرض الموت:

مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالؔی کے آخری زمانے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔حالؔی اپنے اطراف اور ماحول سے واقف تھے۔کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی جو بعد میں بے بسی میں تبدیل ہوجاتی کیوں کہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔بعض اوقات ایک دو لفظ کہہ لیتے۔ یہ تمام علامتیں شدید دماغی Deppression اور Dementia کی ہوسکتی ہیں جو روز بروز بد سے بدتر ہوتا گیا اور آخر کار 31 دسمبر 1914ء رات کے 3 بجے حالی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تجہیز وتکفین:

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری 2 بجے دن حالؔی کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر

کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں: ''جب حالؔی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالؔی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

حالؔی کے لوح مزار پر علامہ اقبالؔ کا فارسی شعر کندہ ہے۔

طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجان ہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالؔی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔

راقم نے اس پورے قطعہ کو جو اقبال نے حالؔی کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر پانی پت میں پڑھا تھا ایک جداگانہ مضمون میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ حالؔی سے اقبال کی عقیدت ظاہر ہو جائے۔ اقبال نے حالؔی کی موت کے مضمون کو بھی بانگِ درا کا جز قرار دیا ان کی نظم حالی وشبلی میں لکھتے ہیں:

شبلؔی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گل ستاں
حالؔی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

ملک بھر میں حالؔی کے انتقال پر جلسے، مجالس منعقد کیے گئے۔ کئی نامور اشخاص نے منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض عمدہ قطعہ تاریخ وفات بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالیں۔

تاریخ از کلام پاک

1333 ہجری

فبشرہ بمغفرۃ

1914 عیسوی

حالؔی کی فاتحہ خوانی چہلم 21 فروری 1915ء کو پانی پت میں شاندار پیمانے پر منائی گئی جس

میں ملک بھر کے مشاہیر شریک ہوئے اور یہ طے پایا کہ حالؔی کی یاد میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

جدول اشعار حالؔی

شمارہ	عنوان	تعداد	زبان	ہیئت	تعداد شعر
۱	قطعات اُردو	۶۷	اُردو	قطعہ	۴۷۰
۲	رباعیات اُردو	۱۶۱	اُردو	رباعی	۳۲۲
۳	غزلیات اُردو	۱۲۳	اُردو	غزل	۱۲۶۱
۴	قصاید اُردو	۸	اُردو	قصیدہ	۳۲۶
۵	منظومات سپاس مدح دعائیہ اُردو	۱۹	اُردو	قطعہ	۳۲۰
۶	شخصی مراثی اُردو	۷	اُردو	متفرق ہیت	۳۸۱
۷	نظمیں اُردو	۳۳	اُردو	قطعہ/مثنوی/متفرق	۳۲۹۵
۸	بچوں کی نظمیں اُردو	۱۴	اُردو	متفرق ہیت	۳۶۷
۹	مسدس مع ضمیمہ اُردو	۱	اُردو	مسدس	۱۳۷۴
۱۰	قطعات تاریخ اُردو	۸	اُردو	قطعہ	۳۸
۱۱	تراجم اُردو	۴	اُردو	متفرق ہیت	۲۶۳
۱۲	متفرقات اُردو		اُردو	متفرق ہیت	۱۰۳
۱۳	اشعار فارسی		فارسی	متفرق ہیت	۶۸۷
۱۴	اشعار عربی		عربی	متفرق ہیت	۱۱۵

تعداد کل اُردو اشعار: 8518

تعداد کل فارسی اشعار: 687

تعداد کل عربی اشعار: 115

تعداد کل اشعار مطبوعہ: 9322

مسدس حالؔی کا اجمالی تجزیہ:

تصنیف رباعی: 1879ء

تصنیف مسدس: 1879ء

تصنیف ضمیمہ: 1886ء

تصنیف عرض حال: 1886ء

ہیت مسدس وضمیمہ: مسدس

ہیت عرض حال: قطعہ/قصیدہ نعتیہ

جدول اشعار مسدس:

رباعی:---------- 2 شعر

مسدس:---------(294 بند)----------882 شعر

ضمیمہ:----------(164 بند)----------492 شعر

عرض حال:----------63 شعر

کل تعداد اشعار

مسدس اور ضمیمہ:(1374) اشعار

مسدس حالؔی کا تجزیہ اور اس کی ہیت (Form) پر گفتگو سے پہلے ہم اُردو زبان میں مسدس بہ حیثیت صنف سخن یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس صنف سخن کی بدولت نہ صرف اُردو ادب بلکہ دنیائے ادب میں شاعری کے عمدہ ترین نمونے محفوظ ہو گئے۔ اُردو مسدس ایک خاص صورت حال ہے جو خود اُردو کا ذاتی کرشمہ ہے عربی اور فارسی مسدس اس کے سامنے بے قدر ہیں۔ اُردو مرثیہ مسدس جس کا مخصوص فارم ہے کئی جہتوں سے عربی اور فارسی مرثیوں سے آگے ہے یہ بلندی مرثیے کے عظیم شعرا کی وجہ سے ہے جن میں انیؔس اور دبیؔر سرفہرست ہیں اور جنہوں نے مسدس کی شکل میں مضامین عالیہ کا ذخیرہ اُردو کے دامن میں بھر دیا۔ شاید اسی وجہ سے ابوالکلام نے کہا تھا۔ اُردو ادب کی جانب سے میر انیؔس کے مراثی اور غالب کی غزلیں دنیائے ادب کو تحفے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہ مسدس جس میں پہلے صرف واسوخت کے سوقیانہ مضامین نظم ہوتے تھے مرثیے میں آ کر

حزنیہ، رزمیہ، اخلاقی سماجی اور جذباتی قدروں کا گلدستہ معلوم ہونے لگا جس کے ہر پھول کی چھے چھے پنکھڑیاں اپنے رنگ و بو سے گلدستہ نظم کو سنوار رہی تھیں۔

مرثیوں کی کامیابی اور عوامی پذیرائی کے ساتھ ان کی تاثیر سے متاثر ہو کر کئی عمدہ یادگار مسدس اُردو میں لکھے گئے جن میں مسدس حالی کے علاوہ پنڈت چکبست کا مسدس رام چندر جی کا بنو باس اور علامہ اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ شامل ہیں۔

یہاں ہم مسدس حالی کی ادبی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اصلاحی نظم کی ہیت مسدس اس لیے رکھی گئی ہے کہ یہاں مختلف موضوعات کو مختلف شعری بندوں میں پیش کر کے زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست کیا جا سکے۔ مسدس مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے لیے شعری ہیئتوں میں سب سے عمدہ ہیت یا فورم ہے۔ مسدس کی زبان سلیس، صاف، شگفتہ اور سادہ ہے۔ اس میں عامی سے عالم تک کے لیے سہولتیں موجود ہیں۔ تشبیہات، استعارات اور محاسن زبان کا ہجوم یہاں نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا گورکھ دھندہ بھی یہاں نہیں۔ یہاں رمزیت اور تخیل کی خاکہ نگاری کی جگہ اصلیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔ اس نظم میں مغربی لٹریچر کی قدروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور عربی فارسی کی ادق تراکیب اور رنگین تقلید سے اجتناب کیا گیا ہے۔ نظم کے لہجے میں مبالغہ، جھوٹ، تصنع، بناوٹ، خوشامد اور چوما چاٹی کے مضامین کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہاں ادب برائے ہدف، شعر زندگی کی تفسیر اور شاعری کا مقصد حیات کی بالیدگی اور اخلاق کی بلندی کا ضامن ہے۔ بعض افراد جن کی زبانوں پر شاعری کے عشقیہ مضامین کا چٹخارہ ہے وہ اسے بے مزہ پھیکی نظم یا قومی مرثیہ سمجھتے ہیں لیکن درد مندوں، اصلاح طلب شاعروں، اور ترقی پسند ادیبوں نے اسے وقت کی رائگنی سمجھا چناں چہ اپنے اپنے انداز میں اقبالؔ لاہوری، اکبرالہ آبادی، چکبستؔ لکھنوی، جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، فیض احمد فیض اور درجنوں دوسرے شاعروں نے اِسے بہتی گنگا سمجھ کر اپنی اپنی زمینوں کو سیراب کیا۔

حالی کے مسدس کی جان ان کا فطری انداز بیان ہے جو سیدھا سادہ ہے مگر اس میں زور جوش اور روانی ہے۔ یہ سادہ، سلیس اور نرم الفاظ دل و دماغ میں اتر جاتے ہیں کیوں کہ ان میں صداقت اور حقیقت ہے۔ جوش اور نغمگی نے اس نظم کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُن مقامات پر

جہاں وہ تاریخی واقعات کو ایک مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں وہاں ان کی شاعری سپاٹ اور بے رنگ وخشک ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اثر پذیر رہتی ہے۔ بعض زبان دانوں نے مسدس میں موجود ادق غیر مانوس عربی فارسی اور ہندی الفاظ کو مسدس کی فصاحت کے خلاف بتا کر اِسے پھیکے پکوان میں کنکر بتایا ہے۔

حالؔی نے مسدس کے آغاز میں جو رباعی کہی ہے اُس کے دوسرے شعر میں مسلمانوں کی زوال پذیر حالت کی عکاسی ہے۔ اس میں مسلسل پسماندگی اور پستی سے افسردگی کی کیفیت ہے ؎

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

شاید اسی کیفیت کا اثر جو سارے مسدس پر چھایا ہوا تھا اُس کو زائل کرنے یعنی نا امیدی کو امید میں بدلنے کے لیے چھ سال بعد حالؔی نے مسدس میں ضمیمہ کا اضافہ کیا۔

مسدس کے شائع ہونے پر ملک بھر میں موافقت اور مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حالؔی کے خلاف طرح طرح کے مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں۔ مسدس کی نقالی کی گئی اور مسدس حالؔی کے جواب میں ''مسدس خالی'' شائع ہوا۔ حالؔی کے خلاف اودھ پنچ لکھنو میں جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کے عنوانات پر یہ شعر لکھا جاتا: ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائے مال ہے

سچ تو یہ ہے کہ پانی پت کے تاریخی میدان کے سپوت حالؔی نے جو ادبی جنگ جیتی اُسے پانی پت کی چوتھی جنگ کہنا چاہیے جس نے ادبی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

مسدس کے آغاز میں حالؔی نے خود فریبی کو انسان کی سب سے بڑی لا علاج بیماری بتا کر کہا کہ اس کا علاج تو بقراط جیسے حکیم کے پاس بھی نہ تھا اگر چہ دنیا میں کوئی درد ایسا نہیں ''کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا''

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

دوا اور پرہیز سے جی چرائیں
یو نہیں رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں

پھر مضمون کو مسلمان قوم سے جوڑ کر ان کی غفلت سے پیدا شدہ صورتِ حال کا یوں جائزہ لیتے ہیں:

یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

غفلت اور پسماندگی اس حد تک ان کی فکر اور تہذیب کا حصہ بن چکی ہے کہ وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنا ذلت وخواری کو اپنی تقدیر سمجھنا اور اسی پر مطمئن رہ کر ظاہری طور پر اسے دین داری سمجھتے رہتے ہیں: ؎

لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے

حالؔی نے مسدس میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کو جوڑتے وقت انہی الفاظ کی قدرت سے کام لیا ہے۔ یہ گریز حالؔی نے انیسؔ کے مرثیوں سے سیکھا ہے جسے آگے چل کر اقبالؔ نے بھی اپنے پرشکوہ مسدس میں برتا ہے۔

وہ دیں جس نے اعدا کو اخواں بنایا
وحوش اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غم خوار دوراں بنایا
گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا
وہ خطہ جو تھا ایک ڈھوروں کا گلہ
گراں کر دیا اُس کا عالم سے پلہ

ان مصرعوں میں وحوش، بہائم، درندوں، گڈریوں، ڈھوروں، گلہ صنعت مراعات النظیر کی عکاسی ہے اسلام سے قبل جزیرہ عرب کی جاہلیت کو حالؔی نے بڑی سچائی سے پیش کیا ہے۔ وہاں کی جغرافیائی حالت، قبیلوں کی کسمپرسی اور بری عادتیں جن کی وجہ سے ان میں اور جانوروں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ قدیم رسومات، تحقیر انسان، بت پرستی اور درجنوں برائیوں کو اسلام نے ایک مثبت انقلاب کی طرح پیش کیا جس میں آزادی، حریت، حقوق انسان کی پاسداری وغیرہ شامل ہیں۔ حالی نے نہ صرف ان مطالب کو صاف، سلیس، شگفتہ عام فہم الفاظ میں ادا کیا بلکہ محاسن زبان اور بیان سے بھی آراستہ کیا۔ اس موضوع کو حالؔی نے تقریباً چالیس اشعار میں نظم کیا جو آپ اپنی مثال ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ — ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں — کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی — فقط آب باراں پہ تھی زندگانی
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی — عرب اور کل کائنات اُس کی یہ تھی
نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی — نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا — کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا — جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا
قبیلے قبیلے کا ایک بت جدا تھا — کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزا پہ وہ نائلے پہ فدا تھا — اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے — تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی — شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر — تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر

ع کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر

حالؔی کے ان شعروں میں حقائق اور صحیح واقعات کو اُجاگر کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ حالؔی اسلام کی آمد کی تمہید باندھ رہے ہیں۔ یہ اشعار مکمل شعریت کی تفسیر ہیں چونکہ اس میں صداقت ہے، سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ جوش اور تاثیر بھی ہے۔ شاعر نے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن کو اپنے مدعا کی پیش کش کے لیے آمادہ کرلیا ہے جو اس پرآشوب زمان ومکان میں رحمت للعالمین ﷺ کی آمد آمد ہے۔ حالؔی نے تقریباً سواشعار میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت، سیرت اور تعلیمات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بعض اشعار میں تلمیحات سے بعض میں اشارات، تشبیہات اور استعارات سے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کے القاب، فضائل، شمائل، خصائل اور اسلام سے مربوط مسائل پر اس سے عمدہ اجمالی شاعری ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس مسدس کے حصے میں حالؔی کی شاعری آسمان سخن پر تارے ٹانکتی معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہاں کچھ مصرعوں کو جوڑ کر مضمون کا نچوڑ پیش کرتے ہیں:

یکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت

ہوئی پہلو آمنہ سے ہویدا دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا
ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت کہ طالع ہوا ماہِ برج سعادت
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے کیا چاند نے کھیت غار حرا سے
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا

اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک خم معرفت کا تھا منہ خام اب تک
سکھائے معیشت کے آداب ان کو پڑھائے تمدن کے سب باب ان کو
سکھائی انہیں نوع انساں پہ شفقت کہا ''ہے یہ اسلامیوں کی علامت''

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر
کہیں فقط صحت کے آئیں سکھائے سفر کے کہیں شوق ان کو دلائے
نشاں راہ و منزل کا ایک اک دکھایا بنی نوع کا اُن کو رہبر بنایا
جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت ﷺ
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

جیسا کہ ہم سب پر واضح ہے مسدس کی زبان، شعری نکات، موضوع اور مطالب پر اعتراضات کیے گئے۔ مسدس کے جواب میں مسدس خالی، ڈفالی، نقالی، جعلی وغیرہ کئی نظمیں لکھی گئیں۔ مختلف مضامین میں جو حالی کے دوستوں اور طرف داروں نے لکھے؛ اعتراضات کیے گئے۔ حبیب الرحمان شیروانی مسدس پر تقریظ لکھتے ہوئے اس کی بعض کمزوریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے وہ سرسید کے وقتی خیالات کا اثر کہتے ہیں۔

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

حالی کے جس شعر پر اعتراضات ہوئے وہ یہ تھا کہ خدا نے حضور اکرم ﷺ کو ہمارے ہی طرح کا ایک معمولی بندہ بنایا ہے اور صرف وہ ایک پیغام بر، نامہ بر، ایلچی یا سفیر بھی ہیں۔ یہ عقیدہ اُن لوگوں کے لیے باعث اختلاف تھا جو حضور ﷺ کو اللہ کا خاص بندہ ''عبدہ'' سمجھتے ہیں اور جس کی تشریح قرآن کی آیات سے کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی ذات مقدس وہ ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں۔ وہ ذات رحمت للعالمین ہے وہ ذات ایسی مقدس ہے جس کے ذکر کو خدا نے بلند کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ ایسی مقدس ہستی ہے جس کے اخلاق عظیم ہیں۔ وہ اللہ کا حبیب ہے اور اللہ ہی کی طرح مومنین کا ولی ہے۔ بندۂ خاکی اور بندۂ نوری میں زمین اور آسمان کا فرق ہے ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

حالی کے خاندان کے بعض افراد جن میں غلام الثقلین، غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین

شامل ہیں اس کے تذکرے سے اجتناب کرتے ہیں۔ حالؔی حضور کائنات ﷺ کے اقوال متبرکہ سے ان اشعار کو جوڑتے ہیں۔

مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا　　بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ　　اسی طرح ہوں میں بھی ایک اس کا بندہ

علامہ اقبال جو حالی کے معتقد اور بعض موارد میں مقلد بھی ہیں حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو عام انسان سے برگزیدہ بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم عبد ہیں اور حضور ﷺ عبدہٗ اور اس عبد اور عبدہٗ کے فرق کو جاوید نامہ میں ابن حلاج کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است　　خویش را خود عبدہٗ فرمودہ ست
عبدہٗ از فہم تو بالا تر است　　زانکہ او ہم آدم وہم جوہر است
جوہر او نے عرب نے اعجم است　　آدم است وہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گر تقدیر ہا　　اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں　　عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر　　ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است　　ما ہمہ رنگیم و ادبے رنگ و بوست
عبدہٗ یا ابتدا بے انتہاست　　عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست؟
کس زرمز عبدہٗ آگاہ نیست　　عبدہٗ جز سر الا اللہ نیست
لا الہ تیغ ودمِ او عبدہٗ　　فاش تر خواہی ، بگو ''ہو'' عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات　　عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

ترجمہ: ''آپ کے سامنے ایک جہاں جبیں گستر رہا (مگر) خود انہوں نے اپنے آپ کو عبدہٗ (اللہ کا بندہ) ہی کہا۔
عبدہٗ تیری سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی۔
ان کا جوہر عربی یا عجمی نہیں۔ وہ جوہر آدم ہے اور آدم سے قدیم تر بھی ہے۔
عبدہٗ سے تقدیروں کی صورت گری ہوئی۔ اس وجود میں ویرانیاں اور تعمیریں ہیں۔

عبدہٗ نے جان فزائی کی اور جان ستانی بھی۔عبدہٗ شیشہ بھی ہے اور بھاری پتھر بھی۔
عبد اور ہے اور عبدہٗ اور۔ہم (عام عبد) سراپا انتظار ہوتے ہیں اور عبدہٗ منتظر ہوتا ہے۔
عبدہٗ زمانہ ہے اور زمانہ عبدہٗ ہے۔ہم رنگ ہیں اور عبدہٗ بے رنگ و بو ہے۔
عبدہٗ ابتدا والا ہے مگر بے انتہا۔عبدہٗ کے لیے ہماری صبحیں اور شامیں کہاں ہیں۔
عبدہٗ کے راز سے کوئی آگاہ نہیں۔وہ لا الہ الا اللہ کے راز کے سوا ہے بھی کیا؟
لا الہ الا اللہ تلوار ہے اور عبدہٗ اس کی دھار۔تجھے زیادہ وضاحت چاہیے تو ہو کو عبدہٗ کہو۔
عبدہٗ کائنات کی کیفیت اور اس کا رازِ باطن ہے۔''

حالؔی کے مسدس کی مخالفت مختلف اسلامی گروہوں کی جانب سے ہوئی جنہوں نے ان اشعار کو غلط بتایا اور حالؔی کو شبلؔی اور سرسیؔد کے خیالات کا پیرو قرار دیا مگر حالؔی پر سرسیؔد، شبلؔی، ڈپٹی نذؔیر احمد اور اقبالؔ کی طرح کفر کا فتویٰ صادر نہیں ہوا جب کہ اُردو ادب کا حالی وہ منفرد شاعر ہے جس سے سب سے زیادہ اور سب سے واضح تر اشعار تکفیر کے خلاف لکھے ہیں۔موضوع کی وسعت اور تحریر کی قلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کسی تشریح اور تبصرے کے بغیر وہ چند بند بھی یہاں درج کرتے ہیں جو خود پڑھنے والا کہہ سکے گا کون سچ کہہ رہا ہے۔

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدا تو کافر — کواکب میں مانے کرشما تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں — پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی ﷺ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی ﷺ سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے — نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں — ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں — وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں — وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

حالؔی نے مسدس میں جگہ جگہ نوع انسان سے محبت کرنا اسلامیوں کی شناخت بتایا ہے اور کئی

احادیث مبارکہ ترجمہ کر کے پیش کیں ہیں۔

سکھائی انہیں نوع انسان پہ شفقت کہا ''ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسائے سے رکھتے ہیں وہ محبت شب و روز پہنچاتے ہیں اُس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں
خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر''

حالؔی کے یہ اشعار آئین اسلام اور سیرت محمدی ﷺ کا درس دے رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے خلق خدا سے محبت، ہمسایوں سے الفت، کمزوروں ضعیفوں کی مدد کو ہم پر فرض کیا ہے۔اوپر کے اشعار صاف ستھری زبان میں اقوال پیغمبر ﷺ اور آیات قرآنی کا خلاصہ ہیں۔

حالؔی نے مدو جزر اسلام مسدس میں تقریباً چونسٹھ بند یعنی دوسو اشعار میں مسلمانوں کی ترقی ان کی عظمت شان وشوکت، علم وحکمت، اخلاق و کردار، اسلامی اقدار، کشور کشائی اور دوسرے ادیان سے صلح وآشتی کے خوبصورت اشعار سے جو صحیفہ تشکیل دیا ہے وہ اس نظم کا قصیدہ معلوم ہوتا ہے جس میں مبالغے اور مدح سرائی نہیں بلکہ سچائی کی قدر دانی اور اعتراف شامل ہے۔مسدس کے اس حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ صدر اسلام اور اگلے زمانے کے مسلمان خواہ عوام ہوں یا حکمران اخلاق انسانی اور قانون اسلامی کے پابند تھے۔

وہ سب خدا اور رسول کے وفا دار، اسلام کے حکم بردار، مسلمانوں کے مددگار اور یتیموں کے غم خوار تھے کیوں کہ وہ سب عشق الٰہی سے سرشار تھے۔ان کی زندگی سیدھی سادی تھی۔

امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی زمانے میں ماجائی بہنیں ہوں جیسی

یہاں حالؔی یہ بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں مسلمانوں کے علم و ہنر کا ستارہ عروج پر تھا اُس

زمانے میں کسی بھی زمین کے حصے یا قوم میں ایسی ترقی اور تمدن کا نشان بھی نہ تھا یہ سب موجودہ ترقیاں مسلمانوں کی دین ہیں جن سے خود آج کے مسلمان محروم ہیں یعنی خود ملت اسلام نے اپنے اسلاف کی میراث سے منہ موڑ لیا۔

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایا

پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا — پریشاں تھا شیراز ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا — چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا
ادھر ہند ہیں ہر طرف تھا اندھیرا — اُدھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے — وہ تھے بھیڑیے آدمی خوار سارے
گھٹا ایک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
کیا امیوں نے جہاں میں اجالا — ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا — ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا

مسلمان علم وحکمت کی تلاش میں ہر مقام پر پہنچے:

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر — ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر — گرہ میں لیا باندھ حکم پیغمبر ﷺ

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

مسلمان حکمرانوں نے شہر آباد کیے۔ فنونِ لطیفہ کو ترقی دی۔ عمارتیں، باغات، خیابانیں دنیا کے کونے کونے میں بنائی گئیں۔ آج یہ آثار ہمارے درمیان بکھرے ہوئے ہیں جو ہمیں ان کی یاد دلا رہے ہیں۔

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت — ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت
یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا — سر رہ کنوئیں اور سرائیں مہیا
وہ مرقد کے گنبد تھے جن کے طلائی — جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر — نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

حالؔی اندلس کی تاریخ سے متاثر تھے۔ یہاں حالؔی نے بڑے جذباتی طور پر اس کی منظر کشی کی شاید علامہ اقبال کی نظم ہمالیہ، شکوہ جواب شکوہ اور قرطبہ پر حالی کے مسدس کا اثر رہا ہوگا اور شاید اسی لیے انہوں نے ان مقامات کا سفر کیا۔

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت ان کی
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

حالؔی بتاتے ہیں کہ یہ اسلامی دانش منداور اسلامی علما تھے جنہوں نے ترجموں اور تشریحوں کے ذریعے یونان کے مردہ علم وفن وتہذیب میں جان ڈالی ورنہ یہ خزانے سب دفن ہو چکے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان تمام علوم وفنون کا پہلے عربی اور اسلامی زبانوں میں ترجمے اور تفاسیر لکھے گئے اور جب اندلس اسپین کی سات سو سالہ اسلامی حکومت تباہ وتاراج ہوئی تو ان دخائر کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔

وہ لقمان و سقراط کے درِّ مکنوں وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانوں پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یونان یہیں سے

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لا کر چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

یہ سچ ہے کہ خلفائے عباسیہ کے دور میں نہ صرف یونانی زبان کے تراجم ہوئے۔ مامون رشید نے قبرص سے بہت سی یونانی فلسفہ کی کتابیں منگوا کر ترجمہ اور تشریح کروایا۔ عباسیوں کے دور میں رومی، پہلوی، فارسی، سنسکرت اور سریانی کتابوں کے بے شمار ترجمے عربی زبان میں کیے گئے۔

ابوجعفر منصور نے ایلچی بھیج کر قیصر روم سے کئی عمدہ کتابوں کی نقلیں منگوا کر ترجمے کروائے۔ لقمان حکیم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چھے سو برس پہلے یونان میں رہتا تھا اور اس کی کہانیاں مشہور تھیں جن کو یونانی زبان سے عربی میں محفوظ کیا گیا تھا جو عربوں کے درمیان امثال لقمان کے نام سے مشہور ہیں۔ یورپ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن پر ان کہانیوں کا گہرا اثر رہا چناں چہ بعض یورپ کے مورخوں نے اس بات کی تائید کی ہے کہ انہیں کہانیوں نے وحشی قوموں کو مہذب ستم کشوں کو رحم دل اور سرکشوں کو نیک اور فرمانبردار بنایا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے حالؔی کا مسدس عامی اور عالم دونوں کو سیراب کرتا ہے۔ حالؔی نے مسدس میں کئی عمدہ معلومات فراہم کیے ہیں۔ مسلمانوں کی علم و ہنر کی پذیرائی کو معتبر حوالوں سے پیش کیا ہے۔ ان حوالوں میں اسلامی مدرسوں کا ذکر نظم کی ہیت میں حالی کے علم اور فن کا معترف ہے جسے آج کا محقق سنگ میل جان کر جادۂ تحقیق پر منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

عراقین[1] و شامات[2] و خوارزم[3] و توراں[4] جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں[5]
وہیں پے سپر[6] کر کے کوہ و بیاباں پہنچتے تھے طلاب[7] افتاں و خیزاں[8]
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا تانتا[9] بندھا تھا

---

[1] عراقین: عرب عراق اور عجم عراق جو ایران کا پہاڑی سلسلہ ہے۔
[2] شام کے مختلف حصوں کو شامات کہتے ہیں۔
[3] خوارزم: خراسان کے شمال میں بحیرہ خوارزم یعنی جھیل یورال کا حصہ جس پر کئی سلاطین نے حکومت کی اور چنگیز خان نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔ اب یہ علاقہ روس کے تحت ہے۔
[4] توران: دریائے سندھ سے جھیل یورال تک کا علاقہ۔ اب یہ حصہ روس اور دوسری سلطنتوں میں شامل ہے۔
[5] سستا یعنی ارزاں۔
[6] پے سپر: طے کر کے۔
[7] طلاب: مذہبی طالب علم
[8] افتاں و خیزاں: گرتے پڑتے۔
[9] تانتا: سلسلہ

نظامیہ [1] نوریہ [2] مستنصریہ [3] نفیسیہ [4] ستیہ [5] اور صاحبیہ [6]
رواحیہ [6] عزیہ [7] اور قاہریہ [8] عزیزیہ [9] زینیہ [10] اور ناصریہ [11]
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کردی [12] و قبچاقیوں [13] کے

دنیا کی سیاحت کی تاریخ میں عہد وسطٰی کے مسلمان سیاحوں کا ذکر نظر آتا ہے۔ بعض مسلم سیاحوں کی کتابیں آج بھی تاریخ عالم میں شاہکار مانی جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل یورپ نے تمام تر تاریخی خزانے مسلمانوں سے ہی لوٹے اور یہ نادر کتابیں آج بھی یورپ اور امریکہ کے مختلف کتب خانوں میں دفن ہیں۔ یورپ کے قدیم مورخوں نے ان کتابوں کے مفید حوالے منتخب کر کے اپنی تصانیف میں شامل کر لی ہیں چناں چہ اب ابوراشد، حاجی خلیفہ طبری، مسعودی، ابن بطوطا، مخریطی، حمزہ اور اصفہانی کے کارنامے مغربی نہیں بلکہ مشرقی لٹریچر میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ حالؔی کہتے ہیں:

---

[1] نظامیہ: اسلامی مدرسے جس کو نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان نے بنوائے۔ پانچ مدرسے ہرات، نیشاپور اصفہان بصرہ اور بغداد میں تھے۔

[2] نوریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں نورالدین ارسلان موصل نے بنوایا۔

[3] مستنصریہ: مستنصر باللہ عباسی کا اسلامی مدرسہ بغداد میں۔

[4] نفیسہ: اسلامی مدرسہ، بانی کا نام نامعلوم۔

[4] ستیہ: دمشق میں صلاح الدین ایوب کی بیٹی خاتون کا بنوایا ہوا اسلامی مدرسہ۔

[5] صاحبیہ: اسلامی مدرسہ قاہرہ میں صاحبیہ وزیر صفی الدین کا بنوایا ہوا۔

[6] رواحیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں ابوالقاسم کا بنوایا ہوا۔

[7] عزیہ: اسلامی مدرسہ بیت المقدس، بانی کا نام معلوم نہیں۔

[8] قارہیہ: اسلامی مدرسہ موصل میں، بانی کا نام معلوم نہیں۔

[9] عزیزیہ: اسلامی مدرسہ بغداد میں، بانی کا نام نامعلوم۔

[10] رینیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں بانی کا نام نامعلوم۔

[11] ناصریہ: اسلامی مدرسہ ناصر الملک کا بنوایا ہوا قبرص میں۔

[12] کردی: کردستاں کے باشندے جن کا ہیرو صلاح الدین ایوبی تھا جس نے بیت المقدس فتح کیا۔

[13] قبچاقیوں: تاتاری قوم جو بحیرہ کاسپین کے شمال میں رہتے ہیں۔

وہ بخارا کا اور کوفہ کا میداں کرہ کی مساحت کے پھیلائے ساماں
اندھیرا تواریخ پہ چھا رہا تھا ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
سرِرہ چراغ اک عرب نے جلایا ہر اک قافلہ نے نشاں جس سے پایا
مورخ ہیں جو آج تحقیق والے تفحص کے ہیں جن کے آئین نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل ان کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے طرارے

انیسویں صدی کا معروف جرمن مستشرق اشبرنگر جو دلی کالج کا پرنسپل تھا، دلی کی سائنٹفک سوسائٹی کا بانی بھی تھا۔ جس نے دلی اودھ اور کلکتہ کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کیں؛ لکھتا ہے کہ برصغیر کے لوگوں کو اپنے اسلاف اور اجداد کی شاہکار کتابوں کو محفوظ کرنے اور مطالعہ کرنے کی توفیق نہیں۔ اشبرنگر نے لکھا ہے کہ اُس نے یورپ کے تمام سیاحوں میں سب سے زیادہ برصغیر کی کتابیں یورپ منتقل کی ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اشبرنگر نے فٹ پاتھ پر بکھری حویلوں میں پڑی ہوئی کتابوں کو یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ کر کے اُردو ادب کی خدمت کی ہے۔ کربل کتھا جو فضل علی کی شاہکار تصنیف ہے اس کا واحد مخطوعہ راقم کو جرمنی کی یونیورسٹی کی لائبریری سے حاصل ہوا جسے اشبرنگر نے بھیجا تھا۔

حالؔی نے مسدس کے چار بند میں علم رجال کا سہرا علمائے دین کے سر باندھا ہے۔ علم رجال میں احادیث کے معتبر اور ضعیف راویوں سے بحث کی جاتی ہے۔ علم رجال ہی سے استفادہ کر کے مورخوں نے تاریخی واقعات کو صحیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشبرنگر لکھتا ہے: ''علم رجال پر مسلمان جتنا فخر کریں بجا ہے۔ نہ ایسی کوئی قوم گذری اور نہ اب ہے جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو برس تک علماء کے حالات زندگی لکھے ہوں۔ ہم کو پانچ لاکھ عالموں کا تذکرہ ان کی کتابوں سے ملتا ہے۔'' یہ سچ ہے کہ علم رجال کی وجہ سے ہی حدیث معتبر اور مشکوک قرار دی گئی۔ راویوں کی شخصیت اور ان کی تحریروں کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا اس طرح تنقید کا آغاز بھی اسلامی علماء نے کیا جس کی پیروی اور تقلید کئی صدیوں بعد یورپ نے کی۔ عالموں نے راویوں کے عیب ڈھانکنے اور بلاوجہ

تعریف سے گریز کیا۔ انہیں جبہ و دستار یا ایمان و کفر حق گفتاری سے نہ روک سکا جس کا اعتراف حالی نے یوں کیا:

گروہ ایک جویا تھا علم نبی ﷺ کا لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

سنا خازن علم دیں جس بشر کو لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر کو
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا مناقب کو چھانا مشالب کو تانا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا
رجال اور اسانید کے ہیں جو دفتر گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دیں پر وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر

خبر اور اثر حدیث کی قسمیں ہیں۔ اسانید میں ایک راوی کے ذکر کے ساتھ تین احادیث بیان کی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے علم رجال سے دنیائے ادب نے استفادہ کر کے کئی مورخوں، مصنفوں، راویوں، اخبار نویسوں کی تحریروں اور تقریروں کو صحت دی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مغرب نے یہ عہدہ مال بھی بازار اسلام سے اٹھایا۔ شاید حالؔی اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس حقیقت پر شعر لکھے ہیں۔

علوم فلکیات اور علوم نجوم عربوں اور اسلامیوں کی وجہ سے دور وسطیٰ کے عہد میں کافی ترقی پر تھے۔ مختلف شہروں میں رصد گاہیں قائم کی گئی تھیں۔ کئی کتابیں اسی دور میں تصنیف ہوئیں۔ رصد گاہ جہاں سے سائینسداں اور منجم ستاروں کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مامون رشید اور دوسرے حکمرانوں نے اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں جیسے بغداد، مراغہ، قاسیوں، سمرقند اور اندلس وغیرہ میں رصد گاہیں تعمیر کروائیں اور کئی کتابوں کے ترجموں سے فائدہ اٹھا کر یورپ نے ٹیلی سکوپ اور لیبارٹریاں بنا کر آسمانوں پر کمند پھینکے۔

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن

نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین کتب خانہ پیرس و روم و لندن
بڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں
سمر قند سے اندلس تک سراسر انہیں کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مامون نے دمشق کے شمالی پہاڑ قاسیوں پر رصد گاہ بنوائی تھی۔ ہلاکو خان نے مراغہ آذربائیجان کے پہاڑ پر خواجہ نصیرالدین طوسی کی زیر سرپرستی رصد گاہ تعمیر کروائی۔ یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ تقریباً ستر (70) سال قبل جب اندلس اسپین کے الحمرا پر نیویارک ٹائمز کے کالم نگار نے انگریزی میں عمدہ کتاب لکھی اور اس میں مسلمانوں کی ترقی کی تمام روداد تفصیل سے لکھی اور نیویارک میں اس کتاب کی رونمائی ہوئی۔ اس تقریب رونمائی میں کتاب کے مصنف سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر اندلس کی حکومت کو تباہ و تاراج نہ کیا جاتا تو یورپ کی ترقی آج کس منزل پر ہوتی؟ جواب دیا کہ شاید چاند پر انسان آج سے دوسو سال پہلے قدم رکھ چکا ہوتا۔

دور جاہلیت میں بھی عرب شاعری اور خطابت میں منفرد تھے۔ وہ عربی ادب اور شاعری کے مقابل دوسری قوموں کو گونگا یا عجم کہتے تھے۔ اسلامی حکومت نے شعر و ادب کا نشہ دوآتشہ کر دیا۔ سبعہ معلقہ تو دور جاہلیت کی نشانی تھا لیکن عرب زبان نے ایسے عمدہ نابغہ روزگار شاعر ادیب اور خطیب پیدا کیے کہ ان کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ عرب کا مقابلہ فصاحت و بلاغت میں مشکل سے کوئی دوسری زبان کر سکتی ہے۔ عربوں کی شاعری اور ان کی خطابت لڑائیوں میں تیر و سنان کا کام کرتی تھیں۔ جان ڈیوٹ پورٹ نے لکھا۔ عرب کے علم ادب نے روم اور یونان کے علم ادب میں دوبارہ جان ڈال دی۔ اورینٹل کمیٹی نے صحیح اعتراف کیا کہ ''فن ادب اور خصوصاً قصص اور حکایات میں کوئی عرب سے بڑھ کر نہیں ہوا'' یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ خطابت کا زور اور خاص انداز یورپ کو اندلس کے مسلمانوں سے ملا۔ حالی نے ان تمام نکات کو خوبصورتی سے نظم کیا

ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

اُدھر روم کی شمع انشا تھی مردہ ادھر آتش پارسی تھی فسردہ
فصاحت کے دفتر تھے سب گا و خوردہ بلاغت کے رستے تھے سب نا سپردہ
یکا یک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی وہ خطبوں میں مانند دریا روانی
سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم کا خزانہ تھا مدفوں زباں اور قلم کا
نواسنجیاں ان سے سیکھی ہیں سب نے زباں کھول دی سب کی نُطقِ عرب نے

اس میں کسی کو شک نہیں کہ اسلامی طبیبوں نے طبابت میں نئی زندگی پھونکی۔ اٹلی کے شہر سلرنوں میں جو اسلامی طبی مدرسہ تھا وہاں ساری دنیا سے طالب علم آتے اور طب میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ اسپین میں بھی کئی مشہور اطبا گزرے ہیں جنھوں نے جراحی کے کئی آلات کا اختراع بھی کیا تھا۔ بوعلی سینا کی طب کی مشہور کتاب شفا صدیوں تک یورپی طب کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ یہ طبیب حکیم بھی تھے ان میں شاعر اور فلاسفر بھی گزرے ہیں۔ حالؔی نے صرف چند اشعار میں کئی اطبا اور دوسرے دانشوروں کو نظم کیا ہے جو ان کی وسعت علمی اور فن پر گرفت کی عمدہ مثال ہے:

زمانہ میں پھیلی طب ان کی بدولت ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
ابوبکر رازی علی ابن عیسا حکیم گرامی حسین ابن سینا

صرف طب ہی میں نہیں بلکہ الٰہیات، ریاضیات، طبیعیات، حکمت، ہندسہ، ہیت اور مختلف علوم وفنوں کے یہ لوگ رسیا تھے جن سے دنیا نے بہت استفادہ کیا۔

غرض فن ہیں جو مایہ دین و دولت طبیعی الٰہی ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندہ اور ہیئت سیاحت تجارت فلاحت عمارت
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا سپید و سیہ پر ہے احساں عرب کا

حالؔی نے مسدس میں لفاظی یا مبالغہ نہیں کیا بلکہ مستند حقائق کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا جس سے حالؔی کی وسعت علمی، دیانت داری اور فن شاعری پر مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یورپ جنوبی یعنی اندلس اسپین اور اس کے اطراف واکناف میں جو اسلامی حکومت سات سو برس تک رہی، جس نے یورپ کی پہلی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جہاں ادب مذہب کے ساتھ ساتھ طبی، معاشی، سائنسی اداروں نے علم و ہنر کو ترقی دی اور فنون لطیفہ کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جس کے نقوش آج بھی ذہنوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں کہ بارہ سو سال پہلے ایسے معماری شاہکار تعمیر کرنے والوں کی سائنٹفک اور تمدنی و علمی سطح کیا ہوگی۔

ایک مقام پر مسدس میں حالی نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ جمہوریت کی قدروں کو کس نے پروان چڑھایا۔ انسانوں کے حقوق کی پاسداری عملاً طور پر کب اور کہاں شروع ہوئی بے شک ان تمام سوالوں کے جوابات تاریخ کے دامن میں دفن ہیں اور کچھ نقش صفحہ ہستی پر باقی ہیں۔ حالؔی کہتے ہیں:

لبرٹی میں جو آج خالق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

فطرت کا تقاضا ہے کہ اشیا کی حیثیت اور قدر و قیمت ان کی تضاد سے کی جاتی ہے یعنی روشنی کی قدر اندھیرے سے، بہار کی قدر خزاں سے، تندرستی کی قدر بیماری سے، بلندی کی قدر پستی سے، علم کی قدر جہالت، آبادی کی قدر بربادی سے، امن کی قدر جنگ سے وغیرہ وغیرہ۔

حالؔی نے مسدس میں انسانی آفاقی اور اخلاقی قدروں کو حیوانی، سفلی اور جنگلی قوتوں سے مقابلہ کر کے انسانیت اور آدمیت کے پیکر کو سنوارا ہے جس کی وجہ سے مسدس کا اثر دوآتشہ بن گیا اور لوگوں نے صحیح لکھا کہ اسے چشم نم اور عزم و استقلال کی نشو ونما کے سوا پڑھا اور سنا نہیں جا سکتا۔

حالؔی نے یہ عمل بعض مقامات پر فوری بعد کیا اور بعض مقامات پر کچھ وقفے سے کیا لیکن وہ مطالب بھی دیر آید مگر درست آید کے مصداق بن کر پیش ہوئے۔ حالی اگر صرف مدِ اسلام یا ارتقائے اسلام کی بات کر کے نظم ختم کر دیتے تو وہ قومی قصیدہ یا سپاسنامہ بن جاتا اور ہمیں پدرم سلطان بود کی روایت سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ حالؔی نے پہلے بیماری کی تشخیص کی پھر اس کے درمان کی ترکیب پیش

کی۔لوگوں کو غیرت وشرم وحیا دلوائی۔انہیں اپنی پسماندگی کا احساس دلا کر اس خواب گراں سے جاگنے کی تاکید کی۔انہوں نے فرد اور معاشرے میں موجود خرابیوں کو دکھا کر انہیں اچھائیوں سے دور کرنے کا راستہ بھی دکھایا۔یہی وجہ تھی کہ مسدس بہت ہی کم مدت میں تمام تر مملکت میں پھیل گیا، مدرسوں میں، مسجدوں کے خطبوں میں، مجالس اور محافل کی تقریروں میں، اخبارات اور رسالوں کی تحریروں میں، عامی اور عالم، مکتب و بازار ہر مقام پر مسدس کی آواز گونجنے لگی مصرعے دلوں میں اتر جاتے اور ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیتے مسدس کے اوائل میں جو مخالفت کی آندھیاں چلیں اُس کے زور سے وہی درخت اکھڑ گئے جو مخالف صف میں کھڑے تھے۔بادسموم غنچہ نسیم بن کر شاعر کی روشن کی ہوئی شمع کی تعریف میں سر دُھننے لگی:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

حالؔی نے مسلمانوں کے تنزل کا سبب معرفت الٰہی اور عشقِ نبوی ﷺ سے دوری بتایا ہے۔وہ سورۂ رعد کی آیت یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہیں بدلتی کو یوں نظم کیا ہے:

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

شاعر نے مسلمانوں کی کمزوریوں، کوتاہیوں، اخلاقی پسماندگیوں اور بری عادتوں پر تذکرہ اور تبصرہ کر کے اُسے اسلام کے باغ کی ویرانی اور تاراجی کا باعث قرار دیا۔حالی کہتے ہیں اگر ہم ایک اونچے مقام سے دنیا کا نقشہ دیکھیں تو ہمیں ہر طرف تازہ سرسبز و شاداب باغات نظر آئیں گے جن کے درمیان ایک خشک باغ بھی دکھائی دے گا۔

ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر — گھٹا کھل گئی سارے عالم میں چھا کر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر — جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں پھول و پھل جس میں آنے کے قابل — ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے — کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

شاعر نے مسلمانان برصغیر کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہے جن کے مسائل اور کرتوتوں سے وہ واقف ہے اور ان کے لیے وہ درد بھرا دل بھی رکھتا ہے جن کی پانچ سو سالہ حکومت کے چند سال بعد کسمپرسی کا یہ حال ہے:

وہ دین حجازی کا بے باک بیڑا مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر
کہ کل فخر تھا جن سے اہل جہاں کو لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو
رہا دین باقی نہ اسلام باقی اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

حالؔی کا لہجہ تند اور تیز ہو جاتا ہے جو عموماً ان کا طرز بیان نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس صورت حال سے کتنا رنج اور درد تھا۔ حالؔی نے ان اشعار میں خود کو بھی شامل رکھا اور کہیں پر واعظانہ گفتگو نہ کی

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے۔ کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے۔

مگر ہم تو اب تک جہاں تھے وہیں ہیں جمادات کی طرح بار زمیں ہیں
گڈریے کا وہ حکم بردار کتا کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے پھیرا

گر انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

اگر ہم علامہ اقبال کی بعض نظمیں جن میں شکوہ جواب شکوہ بھی شامل ہے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اقبال نے موضوع اور لہجہ کو بعض مقامات پر حالؔی سے لیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد تقابل نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ شاعری میں چراغ سے چراغ جلایا جاتا ہے۔

اقبال نے کہا تھا کہ انسان بعض مقامات پر کتے سے بھی پست ہو جاتا ہے۔ ہم نے انساں کو انساں کے سامنے سرخم کرتے دیکھا لیکن کسی کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر جھکاتے نہیں دیکھا۔ حالؔی کہتے ہیں کہ برصغیر کی دوسری قومیں علم و ہنر صنعت و حرفت تعلیم و تربیت میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ وہ سب موجودہ حالات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسلمان مذہب کا

بہانہ بنا کر روز بہ روز گرتے جا رہے ہیں انہیں اپنا رخ بدلنا ہوگا۔

سود ایک ہی رخ نہیں ناو چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

برصغیر کے مسلمانوں پر ایسی آفت آئی ہے کہ عوام تو ایک طرف خواص جن میں حکمرانوں کی اولادیں شاہوں کی نسلیں نان شبینہ کے لیے محتاج ہوگئی ہیں:

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے — کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل — اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل
بزرگوں کے نازاں ہیں جس نام پر وہ — اسے بیچتے پھرتے ہیں در بدر وہ
بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی — بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر — پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در

مسدس کا یہ حصہ طولانی ہے اور مسلسل مضامین کی تکرار بھی ہے۔ دنیائے اسلام کی عظیم تاریخ اور تاریخی فتوحات کے ساتھ ہندوستان کے ذلیل وخوار مسلمانوں کا تقابل ایک ایسا مرقع ہے جسے بیوہ کی فریاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اسلامی حکومتوں کی ترقیاں اور فتوحات حالی نے پڑھی اور سنی تھیں اور مسلمانان ہند کی نکبت بار زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے اور دل و دماغ میں محسوس کر رہے تھے۔ حالی نے مسدس کی ہیت کا سب سے زیادہ استعمال اسی حصے میں کیا ہے جہاں کسی واقعے، خصلت، مسئلہ کو لے کر پہلے اس کی تمہید پھر اس کے مضمون کی تکمیل اور آخر میں ٹیپ کے شعر میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ چند بند ہمارے ادعا کا ثبوت ہیں:

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں — ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں — فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر — نہیں ذات والا میں کچھ جن کو جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر — کہ تھے اُن کے اسلاف مقبول داور

کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی ہیں بایزید اب

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی جگر جس سے ہو شق وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارث انبیا اب

رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوا نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملاّ
وہ دیں جو کہ چشمہ تھا خلق نکو کا کیاقُـــــلّتیـــــن اُس کوغسل ووضوکا
نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پر ہنے سارا عالم

اگر بھولتے ہم نہ قول پیغمبر ﷺ کہ ہیں سب مسلماں باہم برادر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور معین اس کا خود ہے خداوند داور
تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

اس نظم کے سلسلے میں حالؔی نے تقریباً ہر اخلاقی، سماجی، مذہبی، ثقافتی اور ملی کمزوری پر شعر لکھے ہیں جن میں خود پسندی، غرور وتکبر، حسد اور فتنہ گری، تعصب اور غیبت وغیرہ جن کا تفصیل سے ذکر ممکن نہیں اس لیے چیدہ چیدہ اشعار یا مصرع لکھ کر ہم آگے بڑھتے ہیں۔

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر
منھ اپنا ہو گو دین و دنیا میں کالا نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا
مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے نہ ملّا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی
نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے
نہیں راس یاں چار پیسے کسی کو مبارک نہیں جیسے پر چیونٹی کو

حالؔی نے مسدس میں فلسفہ اور حکمت کا دباؤ اور ظاہری دکھاؤ کے ساتھ طبابت اور حکیموں کی نا اہلی اور شاعروں کی جھوٹی اور چوما چاٹی کی شاعری پر کھل کر اعتراضات کیے ہیں۔ حالؔی کے مسدس کا یہی وہ حصہ ہے جو برصغیر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا اور حالؔی کو اعتراضات اور رکیک تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ شاعروں ادیبوں اور صحافیوں نے حالؔی کے پیغام کو جام زہر سمجھ کر اس کو پاش پاش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ حسرت موہانی اُردوئے معلیٰ میں اور اودھ کے اخبار نے تو کئی سال تک سرخی کے طور پر یہ شعر اپنے اخبار کی پیشانی پر لکھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائے مال ہے

کہیں پر مسدس خالی، کہیں پر نقالی، ڈفالی، نقلی اور جعلی وغیرہ عناوین کے تحت اعتراضات ہوتے رہے لیکن حالؔی کا مسدس عوام اور خواص میں مشہور اور معروف ہوتا رہا۔ حالی نے یونان کے فلسفہ کو ایک بے کار مشق بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ اسلامی فلسفہ اور یونانی فلسفہ میں مشترک قدریں موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالی فلاسفر نہیں تھے شاید انہیں فلسفہ کا ابتدائی قاعدہ بھی سمجھنے نہ آیا ہو۔ اسلامی فلسفیوں نے یونانی، ہندی اور دوسرے قدیم فلسفوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس مختصر تحریر میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم یہاں بحث کا دفتر کھول دیں۔ حالؔی کے مسدس کا یہ حصہ ہمیشہ بحث ومباحثہ کا محور رہے گا۔

حالؔی نے ان اشعار میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور شاید بعض دعوے صحیح بھی نہیں۔

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
اُسے وصی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ کوئی بات اس میں نہیں کم زیادہ
زبور اور توریت و انجیل و قرآں بالاجماع ہیں قابل نسخ و نسیاں
مگر لکھ گئے جو اصول اہل یوناں نہیں نسخ و تبدیل کا ان میں امکاں
اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے شفا اور محیطی کے دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتدا کرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

پھراس کے بعد حالؔی نے ایک معمولی مزاحیہ داستان بارہ اشعار میں نظم کی ہے جو بچکانی ہے اور فلسفہ وطبابت سے میل نہیں کھاتی۔ بندروں کو سردی ہورہی تھی انہیں آگ جلانے کی ضرورت ہوئی کہیں آگ دکھائی نہ دی انہوں نے جگنو کو چنگاری سمجھ کر اُسے گھانس پھونس میں دبادیا مگر جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ اس کی روشنی ختم ہوچکی ہے وہ جگنو تھا جسے بندر آگ سمجھ بیٹھے تھے۔

جہاں تک طبابت اور حکیموں کے نسخوں کا تعلق ہے حالی حق بجانب ہیں۔ حکیموں نے محنت اور مشقت اور جدید نسخوں کی تیاری کی طرف کچھ توجہ نہ کی جس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کو ان کی طبابت پر اعتبار نہ رہا۔

وہ طب جس پہ غش ہیں ہمارے اطبا سمجھتے ہیں جس کو بیاض مسیحا
فقط چند نسخوں کا ہے وہ سفینہ چلے آئے ہیں جو کہ سینہ بہ سینہ
نہ ان کو نباتات سے آگہی ہے نہ علم طبیعی نہ کمیسٹری ہے
نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے مریضوں کا ان کے نگہباں خدا ہے
سلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

حالؔی نے کچھ اہم کتابوں اور مصنفوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جیسے قانون، مخزن، نفیسی اور سدیدی وغیرہ۔

مسدس کا وہ حصہ جو طرفداری اور مخالفت کا باعث ہوا جہاں اصل میں پانی پت کی چوتھی

لڑائی لڑی گئی وہ شاعروں سے متعلق تھا۔ یہاں حالؔی کا لہجہ سخت تھا اور اُس سے اہم بات یہ بھی تھی کہ حالؔی نے سکے کا ایک رخ جو خراب تھا بتا کر عمومی شاعری اور سارے شاعروں پر لعن وطعن کی تھی۔ حالؔی نے تمام تر شاعری کی قدروں کو اپنی پسند کے مطابق چنا تھا اُس زمانے میں عمدہ شاعروں کی کمی نہ تھی جنہوں نے صحت مند شاعروں میں زحمت کی تھی چنان چہ ایک ہی رنگ میں خوب و بد کو رنگنے سے مسئلہ اختلافی ہو گیا۔ ایک سالم ذہن کس طرح سے اچھی شاعری کو بری شاعری اور دفتر معجز بیاں کو سنڈاس سے بدتر سمجھ سکتا ہے۔

وہ شعر اور قصاید کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارا علم دین کس طرح سے ہمارے علم ادب سے برباد ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں حالؔی کو مبالغہ اور غلط بیانی پسند نہ تھی۔

اب شاعروں کو جہنم میں جھونکا جا رہا ہے:

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

شاعروں کو سقّے، دھوبی، مہتر اور عوام سے بدتر اور ناکارہ بتانا ہنرمند کی بے احترامی ہے۔ عمدہ شاعری میں شاعر اپنے جذبات کے تحت قلم کو نہیں بہاتا کیوں کہ اس کا اثر معکوس ہو سکتا ہے۔ اگر چہ یہ اشعار زبان زد عام ہوئے کیونکہ لوگوں کے دل شاعروں کے معترف نہ تھے اور ہر شاعر اس الزام کو دوسرے کے سر دھر رہا تھا۔

جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گذر سب ہو میلا جہاں گُم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو ٹھُڑ جائیں مہتر گندھے ہو گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے ''خس کم جہاں پاک'' سارے

حالؔی کے دور میں اور ان کی معاشرتی تہذیب میں غزلوں کا بھانڈوں اور طوائفوں کا گانا کلام اور شاعر کی توہین سمجھا جاتا تھا جب کہ مغربی تہذیب کے اثر سے آج یہ بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے گویّوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں تو بھانڈ ان کی غزلیں مجالس میں گائیں

حالؔی نے ایک اور ناانصافی یہ کی کہ برصغیر کی انیسویں صدی کی شاعری کو عرب کی ہزار سالہ شاعری سے مقابلہ کیا۔

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی
سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر رہے شاعری کو آخر ڈبو کر

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ملک کی شاعری ہر زبان کی شاعری ہر ماحول کی شاعری اور ہر دور کی شاعری میں معجز بیانی سے سوقیانہ شاعری نظر آتی ہے۔ ع

در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یک دست نیست

اُردو ادب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وہ شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اُردو شعر کا مرتبہ فارسی اور عربی شعروں کے ہم پلہ کر دیا۔ کاش حالی اس کا بھی ذکر کرتے؟

☆ حالؔی کا لہجہ اصلاحی نقطہ نظر سے عموماً میانہ رو اور متوازن ہے۔ بعض مقامات پر حالی جذبات کی رو میں بہہ کر اخلاق شاعری اور تہذیب شعر سے تجاوز کرتے نظر آتے ہیں البتہ ایسے اشعار شریعت شعری میں مکروہ سہی مگر عوام میں انہی اشعار کو جاودانہ زندگی میسر ہوئی جیسے مسدس کا یہ شعر:۔

وہ شعر و قصاید کے ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہیں جو بدتر

مسدس میں انگریز حکومت کا اچھے انداز میں ذکر ان کے عمل کردہ اور ترقی پذیر صنعتوں کی پذیرائی اور سرزمین ہند پر مفضو بہ قوم کی برکتوں کا خیر مقدم حالؔی کی شاعری کا کمزور رخ تھا وہ ہوا کے رخ پر چلنا ہی صحیح راستہ سمجھ رہے تھے۔ قصیدہ جو بلی خود قصاید ناپاک کے دفتر کا حصہ تھا لیکن ان تمام مسائل کو ہمیں اُس زمانے کے محبوس شکست خوردہ ماحول کے پس منظر میں دیکھنا پڑے گا جہاں برصغیر میں صرف مسلمان قوم انگریزوں سے دور ہوتی جا رہی تھی اور ہر ترقی کے راستے کو گمراہی اور غیر مذہبی سازش سمجھ کر افلاس اور جہالت کے دلدل میں پھنستی جا رہی تھی۔ حق گفتاری اور آزاد بیانی

کا حشر لوگ فضل حق خیر آبادی، منیر شکوہ آبادی اور محمد باقر کے ساتھ انگریزوں کے سلوک میں دیکھ چکے تھے۔ حالؔی نے ملک کی ترقی صنعت وحرفت تعلیم وتربیت کے ساتھ اخلاق سازی اور عزم واستقلال زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بیان کر کے سکہ کا دوسرا روشن نرم دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے مسدس کی بابت ٹھیک بیان دیا ہے کہ اسے صرف طولانی واعظ کہہ کر ٹالنا نہیں چاہیے بلکہ یہ اشعار درس عمل اور واقعیت وجدانی کیفیات سے محروم نہیں۔

حالؔی نے بیان کی اصلیت کے ساتھ زبان کی سادگی شگفتگی اور تازگی پر کام کر کے اُسے جدید چہرہ دیا ہے۔ شاید حالؔی ان پہلے شعرا میں سب سے ممتاز شاعر ہوں جنہوں نے عام فہم اور بول چال کی زبان نظم کرنے میں نرم اور آسان اُردو الفاظ کے ساتھ ایسے ہندی الفاظ نظم میں داخل کیے جس سے شعرا کا حلقہ واقف نہ تھا یا ان الفاظ کو استعمال کرنے کی ضرورت اور جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اس عمل سے حالؔی نے اُردو شاعری کو برصغیر کی زمین سے جوڑ دیا۔ اس جدت کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی اور عربی تراکیب تلمیحات، اصطلاحات، فقرے اور تمثیلیں بھی بکثرت استفادہ کیں۔

حالؔی نے یہاں سے مسدس کو امیروں جاگیرداروں کی بدچلنی اور عیش پرستی کی طرف موڑا جنہیں اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ ان کی کچھ خاندانی، سماجی دینی اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ حالؔی تقریباً اُن سے مایوس ہو گئے تھے اور ان کی نظر محنت کش تعلیم وتربیت یافتہ افراد پر جمی تھی۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے — تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیّا ہے کوئی

نشہ میں مئے عشق کے چور ہیں وہ — صفِ موجِ مژگاں میں محصور ہیں وہ
اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے — تو دل ان کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جیسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں

قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر ان کو کس مد میں کوئی کھپائے

حالؔی کے مسدس کا سرمایہ یہی نوجواں تعلیم یافتہ محنت کش تھے جنہیں وہ قوم کی آیندہ زندگی سمجھ رہے تھے:

یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں
یہی شمعِ اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی

حالی نسلِ جدید کو ترغیب دیتے ہیں کہ انگریزوں نے جو ملک میں سہولتیں دی ہیں خواہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی ہوں یا تجارت صنعت وحرفت کی اُس سے مکمل فائدہ اٹھاؤ پھر خود بنو اور دوسروں کو بناؤ۔ بعض لوگوں نے اس کو انگریزوں اور انگریز سرکار کی مدح کہہ کر حالؔی پر انگریز پرستی کا الزام لگایا۔ حالی کہہ رہے تھے گنگا بہہ رہی ہے دوسری قومیں اس سے فائدہ حاصل کر رہی ہیں تو تم بھی کچھ کرلو۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا وسیلہ ہے اب وہ سراسر ظفر کا
کرو قدر اس امن و آزادی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں

مگر ایک تم ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز غاصب تھے جن کا مقصد استحصال تھا چناں چہ ان کے لیے یہ مصرعے حالؔی کے ٹھیک نہیں۔

ع کہ راجا سے پر جا تلک سب سکھی ہیں
ع لٹیرے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو

حالؔی کا یہ بند بھی نشانہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ اقبالؔ نے تو کھلے لفظوں میں یہ کہا ہے:۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

حالؔی کہتے ہیں:

نہ بد خواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں
وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے

یہ جو اعتراض حالؔی پر کیا جاتا ہے کہ وہ انگریز پرست تھے اور اس کی تائید میں ان کے کلام سے چھانٹ چھانٹ کر کچھ اشعار اور مصرعے پیش کیے جاتے ہیں اُس میں تھوڑی بہت حقیقت ضرور ہے کہ حالؔی نے ایک غاصب قوم کو جو تبیض نژاد، رنگ، قوم اور زبان میں مشہور تھی ایک ہمدرد اور قابل تقلید قوم بتایا جس کے اشارے انہوں نے کئی قصیدوں، قطعوں، مسدس اور ملکہ وکٹوریا کے مرثیے میں بھی کیے۔ اس مسئلہ پر انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں اُس ماحول اور اُس زمانے کی سیاسی دنیا کو بھی دیکھنا چاہیے۔ برصغیر کی اکثریت مسلمان سلطنتوں کی نابودی کا جشن منا رہی تھی چناں چہ غدر کے فوری بعد وہ سب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے اور ان کی سماجی ادبی رفاہی، علمی، تعلیمی، تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے یہ اور بات ہے کہ بعد میں اکثریت کا ایک خاص گروہ جس کی سرکردگی گاندھی جی اور ان کے رفقا نے کی انگریزوں کی مخالفت کی اور اُس وقت انگریزوں کو یہ محسوس ہوا کہ برصغیر جاگ رہا ہے اور ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ایسے پر آشوب دور میں سرسید کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انگریزوں سے مخالفت کرنے کے بجائے اکثریت کی طرح ان کے سماجی، رفاہی اور تعلیمی کاموں سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ عزت نفس کی زندگی بسر کر جائیں۔ انگریزوں میں سب جفاکش، ظالم، غاصب اور قاتل نہ تھے بلکہ کئی شریف انسان برٹش ظلم کے کم از کم زبان سے قائل ضرور تھے۔ برصغیر میں امن وامان کی برقراری ضروری تھی کیوں کہ یہ بھی دنیا کا اصول ہے کہ جب اچھے لوگ منہ موڑ لیتے ہیں تو برے لوگ اپنا کام کر جاتے ہیں۔ کسی بھی حکمران کی کرسی کبھی خالی نہیں رہتی اگر شریف لوگ اُس کرسی کو پسند نہ کریں تو رذیل اور بدمعاش اُس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالؔی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح اس کوچہ سے بغیر صدا و شور گزر سکتے تھے اور اس سے اپنے شخصی فائدے بڑھا سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ صرف اچھے کام کرنے کا انعام نہیں بلکہ اُن کاموں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا جس کو نہیں کیا گیا اور جس کے کرنے میں قوم کا فائدہ تھا۔ اسی لیے حالؔی نے یہ بڑا پتھر تن تنہا اٹھا کر محراب انسانیت میں سجا دیا جس کی وجہ سے حالؔی ہر دور کے حالی ہوئے۔ برصغیر کی بے روزگاری، بے کاری، غربت اور افلاس کی ایک بڑی وجہ ترقی یافتہ قوموں کی استعمار گیری تھی۔ یورپ کے کارخانوں سے بنا ہوا مال برصغیر میں استعمال ہوتا یہاں صرف مصرف کنندہ ہوتے تھے اور تولید دھندے سب امیر یورپ کے تاجر تھے۔ اُردو ادب کا پہلا شاعر جس نے اس طرف عوام کی توجہ مبذول کی؛ حالؔی ہیں۔

ذیل میں مسدس کے کچھ بند ترتیب دیے گئے ہیں جو موضوع کو روشن کرنے کے لیے کافی ہیں:

ہنر اور فن واں ہیں سب گھٹتے جاتے — ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے — طبیب اور ان کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر — نہ ناظم ہیں سرسبز اُن کے نہ ناشر
اگر وہ پہننے کو ٹوپی بنائیں — تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں — تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ — مکینکس کی رَو میں تاراج ہیں وہ
نہ پاس ان کے چادر نہ بستر ہے گھر کا — نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا

نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں
جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت
ہو نجّار پر بند راہ معیشت دکانوں میں ڈھونڈھی نہ پائیں بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیوپار واں سب طفیلی ہیں سیٹھ اور تجار واں سب
یہ ہیں ترک تعلیم کی سب سزائیں وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے
بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے کوئی کشتی دین و ملت کو تھامے
بنے قوم کھانے کمانے کے قابل زمانہ میں ہو منھ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ لگیں کرنے آپ اپنی اپنی بد وہ
کرو قدر اُن کی ہنر جن میں پاؤ ترقی کی اور اُن کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے اُن کے مل کر بڑھاؤ ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے بٹھائیں انہیں سر پہ اپنے پرائے
یہی سلطنت کی ہے کافی اعانت کہ ہو ملک میں امن اُس کی بدولت
نفوس اور اموال کی ہو حفاظت حکومت میں ہو اعتدال اور عدالت
نہ تورا رعیت پہ بیجا ہو کوئی نہ قانون چھٹ کار فرما ہو کوئی

حالؔی کا مسدس دل کی آواز تھا اس لیے ہر پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں اتر جاتا اور متاثر کرتا۔ عہد رفتہ کی تعریف اور عہد حاضر کی تذلیل سے ایک خاص قسم کی بے چینی اور کنفوژن پیدا ہوتا تھا۔ مسدس کے آخری بندوں کے اشعار میں مایوسی اور افسردگی تھی چناں چہ اکثر لوگ ان

پر آنسو بہاتے تھے جو حالی کی نظم کا مقصد نہ تھا: ؎

مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے
نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی
بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

حالی کے الفاظ ہیں ''نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے قوم کی خرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ وسناں کا کام لیا گیا تھا۔ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اُسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوشش رایگاں نظر آنے لگیں شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہو سکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔'' (دیباچہ ضمیمہ: ۱۸۸۶ء)

حالی نے مسدس کے چھے سال بعد ضمیمہ اور عرض حال بجناب سرور کائنات ﷺ تصنیف کیا۔ ضمیمہ میں (۱۶۴) بند یعنی (۴۹۲) اشعار ہیں چناں چہ کل مسدس کے اشعار کی تعداد ضمیمہ کے شامل کرنے کے بعد (۱۳۸۰) ہو جاتی ہے۔ نعتیہ نظم میں صرف تریسٹھ اشعار ہیں شاید یہ تعداد حضور اکرم ﷺ کی طبعی عمر کو ملحوظ کر کے انتخاب کی گئی ہو۔

ضمیمہ کا اصلی مقصد مسدس میں بیماری کی تشخیص کے بعد اس کا علاج کا تذکرہ ہے۔ حالی جانتے تھے کہ اسلام میں ناامیدی کفر اور گناہ تصور کی جاتی ہے اسی لیے اس کا آغاز یوں کیا گیا:

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو

پھر مسلسل دس بندوں میں یعنی تیس اشعار میں امید پر تمام جمال وجلال وکمال کے ساتھ روشنی ڈالی۔ تاریخی واقعات، مذہبی روایات، دنیاوی تجربات اور کامیابی اور کامرانی کی حکایت پیش کر کے افسردہ اور رنجیدہ دلوں کو گرمایا کہ یہ امید ہی تھی جس نے ذات اور کائنات میں انقلاب برپا کیا اور انسان وانسانیت ترقی کر سکی۔ محاوروں اور تاریخی حوالوں کے اشارے دیکھیے: ؎

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں
سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی
فریدوں کو ضحاک سے ہے تو لڑاتی
سکندر کو شانِ کئی تونے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تونے بخشی

تلمیحات کے پیکروں میں قرآنی اور اسلامی واقعات کی طرز بیانی بتاتی ہے کہ حالؔی ایک عظیم ناظم تھے انہیں مصرعوں کی ترتیب، نغمگی اور تاثیر پر پوری قدرت حاصل تھی۔

سفینہ پئے نوح طوفاں میں تو تھی سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تو تھی دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی
مصائب نے جب آن کر ان کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

امید اور نا امید کی تضادی کیفیت کو ان رواں مصرعوں میں دیکھیں کہ حالؔی کے یہاں صنعتِ تضاد لاشعوری طور پر کیا کیا مضمون باندھواتی ہے: ؎

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تونے (ڈوبنا۔ تیرنا)
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تونے (بگڑنا۔ بنانا)
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تونے (اکھڑنا۔ جمانا)

اجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے (اجڑنا۔ بسانا)
بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے (پست۔ بالا)
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے (اندھیرا۔ اجالا)
قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی (پیر۔ جوان)
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی (خورد۔ کلاں)

حالی نظم کے تسلسل میں موضوع کو ترقی دے کر پُر تاثیر بناتے ہیں اور پھر ایک ایسا عمدہ شعر جڑ دیتے ہیں جس سے نظم کا آیندہ مضمون جڑ جاتا ہے۔ یہی کیفیت قصیدوں میں گریز کا شعر پیدا کرتا ہے میر انیسؔ نے مسدس مرثیہ میں مختلف اجزا کو جوڑنے کے لیے یہی عمل کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا: ؎

جہالت میں وہی قوم کی رہنموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مصرعِ ثانی لاجواب ہے۔ کس نے کہا حالیؔ کی شاعری پھیکی اور بدحالی سے دوچار ہے۔ پھر حالیؔ کہتے ہیں کہ اس قوم میں نہ جان باقی ہے نہ آن بان اور شان باقی ہے مگر کیونکہ غیرت ابھی باقی ہے اس لیے امکان ہے کہ ترقی کریں گے اور جو کچھ کھویا ہے اس میں کچھ پائیں گے: ؎

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی
بگڑنے کا گو ان کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے
بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی
دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر
فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر
گلیم قناعت کو ثروت سے بہتر

انہیں موت ہے بار منت سے بہتر
سر ان کا نہیں در بدر جھکنے والا
وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا

حالؔی نے قوم کی حالت اُس بیمار کے مانند بتائی ہے جو بدنی کیفیت سے بہت کمزور مگر حواس اور ہمت سے قوی ہے اس لیے امکان شفا ہے اور ایسا بھی نہیں کہ ساری قوم بیمار اور نکمی ہے بلکہ ؎

چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ
نکموں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں
جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا
یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے

شبلی نے اچھے شعر کی شناخت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ روزمرہ میں ہو جس کے ترجمے اور تشریح کی ضرورت پیش نہ آئے اس لیے ہم رواں، سلیس، شگفتہ سیدھے سادے مصرعوں کو بغیر کسی تشریح کے پیش کر رہے ہیں۔ حالؔی نے مسدس کو عوامی بنانے کے لیے اس کی زبان بھی عوام کی بول چال کی صاف ستھری زبان رکھی جس میں آلائش بناوٹ، شاعرانہ ایہام و ابہام نہ ہوتا کہ عامی اور عالم دونوں اپنی ذہنی اور فکری استطاعت کے مطابق مستفید ہو سکیں۔

حالؔی بتاتے ہیں کہ برصغیر کا قومی جمود ختم ہو رہا ہے جو نیک شگون ہے اگرچہ ابھی ترقی اور شائستگی سے دور ہیں لیکن امید ہے کہ جلد صحیح راستے پر چلیں گے۔ خوبصورت اور عام فہم استعاروں میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں جس سے مطلب روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں: ؎

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا
کہ مکروہ تھی بو تو کڑوا مزا تھا
پر اب اس میں رو کچھ کچھ آنے لگی ہے

عفونت وہ پانی سے جانے لگی ہے
وہ غفلت کی راتیں گذرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اترنے کو ہیں اب
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو
اسی جزر و مد نے ڈبویا ہے ہم کو

انسان کی بیداری اس کی ترقی کی ضامن ہے۔خودفریبی جگ فریبی سے مہلک تر ہے۔

اگر با خبر ہیں حقیقت سے اپنی
گذشتہ اور آیندہ حالت سے اپنی
تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا ہمارا
نہیں دور منجدھار سے کچھ کنارا

حالؔی نے الپ ارسلان اور طغرل بیگ کی نصیحت آموز گفتگو کے بعد لقمان کی مشہور کہانی خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کو نظم کر کے:۔

یوں ہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

تمام تر توجہ محنت اور کوشش پر مبذول کی ہے۔حالؔی دیکھ رہے تھے کہ قوم تقدیر کا بہانہ بنا کر محنت سے فرار اختیار کر رہی تھی۔وہ تدبیر اور کوشش سے کام نہیں لیتے تھے:۔

نہیں لیتے کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ
ہلانے سے ڈوری کے ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

اصل برکت محنت ہے۔یہی ترقی بشر کا راز ہے۔یہی کوشش ہے جس سے قوموں کی آبرو اور حیثیت قائم ہے۔کسانوں کی محنت سے روٹی ملتی ہے۔اگلوں کے کاموں سے پچھلے فایدہ مند ہیں۔دین اور دنیا دونوں کوشش سے حاصل ہوتے ہیں:۔

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری
اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
ہلاتے نہ اگلے اگر دست و بازو
جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبو
نہیں ملتی کوشش سے دنیا ہی تنہا
کہ ارکانِ دیں بھی اسی پر ہیں برپا
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی
حلال آدمی کو ہے کھانا نہ پینا
نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینا

حالؔی نے ضمیمہ میں جہاں جاہلوں کاہلوں کی مذمت کی ہے ان پر طنز وطعن کیا ہے وہیں عالموں، کاملوں، محنت کشوں اور نیک لوگوں کی تعریف بھی کی ہے۔ یہاں سکہ کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ضمیمہ مسدس کا یہ حصہ طویل ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسدس کے کچھ موضوعات میں کلی تکرار بھی موجود ہے ۔

سب ایسے تن آسان و بے کار و کاہل
تمدن کے حق میں ہیں زہر ہلاہل
بچو ایسے شوموں کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں سے
مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے
شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو

وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی
انہیں سے ہے رتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر ان سے روحانیوں نے جھکایا

پھر حالی بزرگان قوم و دین حکمران اور فلاسفر وادیبوں کا ذکر کر کے علم کا نورانی دریچہ کھولتے ہیں۔ حالؔی نے مسدس میں کچھ موضوعات کو چھوٹے بڑے قصوں اور تاریخی واقعات سے موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کاہل لوگوں کو سوئے ہوئے خرگوش سے نسبت دے کر کچھوے سے شکست دیتے ہیں: ؎

یوں ہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

کہیں الپ ارسلان اور طغرل کی گفتگو سے نصیحت کرتے ہیں: ؎

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک
حوادث کے بن گذارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں
بہت یکہ تازوں کو یاں گرتے دیکھا
سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

ایک مقام پر عقل مند انسان کی بات چیت کو مکالمے کی صورت میں کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ سب سے بڑی نعمت عقل ہے اس کے بعد علم و ہنر اور مال و دولت کا مقام ہے۔ اگر یہ نعمتیں نہ ہوں تو انسان ترقی نہیں کر سکتا: ؎

کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا؟
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا

کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر

کبھی بندر اور جگنو کی داستان بیان کرتے ہیں اور کبھی چیونٹی کی اپنی قوم پر خدمت کو ظاہر کر کے انسانوں کو عبرت کا سبق دیتے ہیں کہ ہم اتنے خودغرض ہیں کہ اس حقیر سے کیڑے سے بھی گئے گزرے ہیں ۔

ذخیرہ ہے جب چونٹا کوئی پاتا
فتوح اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا
کمائی سے ایک اک کی لاکھوں ہیں پلتے
جب اک چونٹا جس میں نہ دانش نہ حکمت
کرے ان پہ وقف اپنی ساری غنیمت
تو اس سے زیادہ ہے بے عزتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

حالؔی مسدس میں مسلمانوں کی سماجی اقتصادی اور فکری قدروں میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ معمولی پیشہ بھی اگر اچھے طریقے اور ایمان داری سے کیا جائے تو وہ قابل عزت اور قابل قدر ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کبھی اپنی ترقی سے مایوس نہ ہو۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ ادنیٰ اور معمولی پیشوں سے منسلک تھے۔ کوئی صفار یعنی تانبے کے برتن بنانے والا تھا، کوئی دھوبی، کوئی بڑھئی کوئی زین گر اور کوئی روئی دُھننے والا تھا۔

حکومت ملی اُن کو صفار تھے جو امامت کو پہنچے وہ قصار تھے جو
وہ قطب زماں ٹھہرے عطار تھے جو بنے مرجع خلق نجار تھے جو
ابوالفضل یاں اٹھے سراج کتنے
ابوالوقت ہو گذرے حلاج کتنے

حالؔی مسلمانوں کے ذہنوں سے جھوٹی شان اور جاگیرداری آن بان دور کرنے کی کوشش میں تھے۔ ان کا سراسر کلام اس کا گواہ ہے۔ بچوں کی نظموں میں ایک مثالی نظم ہے جس میں بچہ ماں

سے کہتا ہے کہ میں کسان بنوں گا، دھوبی بنوں گا، کوئی کہتا ہے بڑھئی، ڈاکیہ، موچی وغیرہ بنوں گا۔ رزق حلال کماؤں گا۔ جاگیرداری فکر میں ان کاموں کی طرف رخ کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا وہ چوری بدمعاشی اور بھیک مانگنے کو ان کاموں پر ترجیح دیتے تھے۔

حالؔی نے مسدس میں اس گروہ اور جماعت کی نشان دہی کی ہے جن کی بدولت کچھ زندگی اور روشنی باقی ہے۔ حالؔی کی تمام امیدیں اور حسرتیں ان سے ہیں جن کے بارے میں کہتے ہیں:

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے — شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر — بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا — کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا
یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے — جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو — وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کی — اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی
کسی پر چلے تیر آماج یہ ہیں — لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں
بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے — سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو — انہیں سے ہے گر شرف آدمی کو
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی — انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

☆.....☆.....☆

''مسدس پر اکابرین کے تاثرات''

سرسید احمد خان:

''یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک دور پیدا کر دیا اس عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق ومبالغہ اور تمثیل واستعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر موثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے۔''

سرسید علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھتے ہیں: ''حالؔی سے ہم نے کہا: اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے۔ معجز بیان دی ہے۔ للہ اپنی قوم کے حال پر روؤ۔ قوم کی جو تباہ حالت ہے اُس پر مثل قرطبہ کے مرثیہ لکھ دو۔''

سچ تو یہ ہے کہ مسدس میں حالی مسلمانوں کی حالت پر خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ سرسید مسدس کی اسٹیج کیفیت کے بارے میں اپنے سفر نامے پنجاب مورخہ 1886ء میں لکھتے ہیں: ''امرتسر کے مسلمانوں نے ایک تھیٹر کا منظر پیش کیا جس کا پردہ اٹھنے پر ایک کشتی جس کے لوگ سوار ہے تھے طوفان میں جکڑ چکے تھے اور وہ ڈوب رہے تھے۔ وہاں حالؔی کے مسدس کے بند کوئی پڑھ رہا تھا اور لوگ رو رہے تھے۔''

سرسید خط لکھتے ہیں۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہوگا.....متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔

حق ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔

شیخ محمد اکرام:

مسدس میں حالؔی کے آنسو خالص آبِ حیات کے چھینٹے تھے دل سے نکلے ہوئے۔

علامہ اقبالؔ:

آں لالہ صحرا کہ خزاں دید و بیفرد
سید دیگری او رانمی از اشک سحر داد
حالؔی ز نواہاے جگر سوز نیا سود
تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

یعنی وہ دشت کا لالۂ جو خزاں زدہ اور پژمردہ تھا۔ ایک سید (احمد خان) نے اشک سحر گاہی سے اس کو تازہ کیا۔ حالؔی (الطاف حسین) نے اپنے جگر جلانے والے نغموں کو مسلسل اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ اس لالۂ تر پر داغ کا نشان بن جائے۔

اقبالؔ کی زبان میں حالؔی ''میر کارواں'' ہے کیونکہ اس کی ذات میں وہ تینوں اوصاف موجود ہیں جو موصوف نے اپنے اس شعر میں لازم قرار دیئے ہیں ؎

نگہ بلند ، سخن دل نواز جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

سید سلیمان ندوی:

ہماری زبان کی نظم و نثر میں جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں قبول عام اور حیات دوام اگر کسی کو نصیب ہوئی تو وہ مولانا حالی کا مسدس ہے۔ قبول عام کا حال یہ ہے کہ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور جاہلوں سے لے کر عالموں اور واعظوں تک اس کے بند کے بند پڑھے ہوئے ہیں۔

مسدس کی اس قبولیت پر تعجب اس لیے آتا ہے کہ شاعر کی طرف سے جیسا کہ خود اُس نے کہا ہے مذہبی حلقوں میں کافی بدگمانی تھی۔ مسدس میں بے عمل اور جامد علما کی دھجیاں بکھیری گئی تھیں،

جُھوٹے پیروں اور مشائخوں کی برائیاں بتائی گئی تھیں، عیش پرست اور نکمے امیروں کا خاکہ اُڑایا گیا تھا، جھوٹے خوشامدی شاعروں کی ہجو کی گئی تھی، عام مسلمانوں کے مشرکوں جیسے خیالات کو برا کہہ کر اُن کے دل دُکھائے گئے تھے۔ غرض قوم کا وہ کون سا طبقہ تھا، جس کے لیے حالی کے یہ دل دوز طعنے دل پسند ہو سکتے تھے، چنانچہ اس مسدس کا نکلنا تھا کہ مذہبی شاعروں نے اس کا جواب لکھا، ادبی شاعروں نے اس کی زبان اور شاعری پر لے دے کی، کافر گروں نے اس کے بعض مضامین کی بنا پر فتوے مرتب کیے، عام مسلمانوں نے اس کے چبھتے ہوئے نشتروں پر شور وغل کیا، مگر باد مخالف کے یہ جھونکے سچائی کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے۔ سچی بات دل میں اترتی چلی گئی، اور اُس کی تاثیر رگ رگ میں پھیلتی گئی۔ کل جو نفریں کرتے تھے وہ تحسین کرنے لگے، جو اسلام کے لیے اس کو کبھی زہر قاتل کہتے تھے، وہ آبِ حیات کہنے لگے۔ غور کے قابل یہ بات ہے کہ مسدس کی اس مقبولیت اور پسندیدگی کا راز کیا ہے۔

مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثہ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کیے تھے جن کو سن کر اُن بے خبروں کو دفعتاً 1857ء کے حادثہ خونیں کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی۔ شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر اُن کی حیرت کو دُور کیا، اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں زندگی تعجب انگیز تھی۔

مسدس میں قوم کی غیرتی رگ کو حرکت میں لانے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی قومی تاریخ کے پُر فخر کارناموں کو شاید سب سے پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب سے اس ملک میں بیان کیا گیا تھا، رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں کے فخر وغرور کا سامان بھی تھا۔ اس نشہ نے بھی لوگوں کو اس مسدس کے پڑھنے کا چسکا لگایا۔ عرب کی حالت، رحمت عالم کی بعثت، قرآن کی تاثیر، اسلام کا شکوہ، فتوحات کی وسعت، علوم وفنون کی ترقی، علما اور حکما کا کمال، تعمیر بلاد، سیر وسیاحت، اور بغداد و اندلس کے قابل فخر آثار، اس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اس میں نظم کیے گئے تھے کہ مسلمانوں کو فقیری میں بادشاہی کا مزہ آ گیا، اُن کے جھکے ہوئے سر غرور سے اونچے ہونے لگے، اور گذشتہ دورِ عظمت کی کہانی اس پستی اور تنزل میں اُن کو تسکین و تسلی کا سرمایہ معلوم ہونے لگی۔

''عرب، ہند، مصر، اندلس، شام و دیلم'' ہر جگہ کی کہانی مسدس کی زبانی مسلمانوں نے سنی، اور اس سینما میں اُن کو بغداد کا حریم خلافت اندلس کا بیت حمرا، غرناطہ کی شوکت، بلنسیّہ کی عظمت، اشبیلیہ کے محراب و در، اور قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر، سنجار اور کوفے کے میدان اور سمرقند، مراغہ اور قاسیون کے رصد خانے سب نظر آنے لگے، پڑھنے والے پر عجب کیفیت طاری ہوتی، کبھی روتا اور کبھی ہنستا، اور ان دونوں کیفیتوں سے ہر گھڑی دل میں نئی لذت پاتا۔

غم اور فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب و غریب کتاب میں موجودہ حالت کا احساس پیدا کر کے آیندہ کی فکر کا سامان بھی تھا۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ کے عیوب اور کمزوریوں کا راز فاش کر کے اس کے سامنے اپنی حالت کے سدھارنے کا خاکہ بھی کھینچا گیا تھا، احساس کے نشتر سے زخم کے فاسد مادوں کے نکالنے کے بعد اُن کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی، اس لیے مسلمانوں میں اس کے ذریعہ جس کو تنزل کا احساس ہوا ترقی کی فکر بھی پیدا ہوئی۔

غرض مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی حالت و کیفیت کا ایک آئینہ تھا، جس میں اُس کے چہرہ کا ایک ایک خط و خال نمایاں تھا۔ اُس کی پیدائش، اُس کا نمو، اُس کی جوانی، اُس کا بڑھاپا، اُس کی بیماری، اُس کے عوارض، اُس کی کمزوری ہر چیز اس میں نظر آ رہی تھی، اس لیے ہر مسلمان کو جس میں ذرا بھی حِسّ تھی، اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا۔

اُس شاعری میں جو صرف تفریح طبع کا سامان رہ گئی تھی، اور جس میں گل و بلبل کی حکایت، حسن و عشق کی روایت اور رقیب سیہ رو اور فلک پیر کی شکایت کے سوا کچھ اور نہ تھا، شاعر نے اپنی مسیحا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی روح پھونک دی۔ لفظ سیدھے سادے، ترکیبیں بے تکلف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و استعارہ سے پاک، مگر ہر شعر جوش بیان سے لبریز، وفور احساس سے معمور، اور درد و غم سے بھرا ہوا۔

اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا۔ مسدس اُس زمانہ میں واسوخت کے لیے پھر اہل بیت کرام کے دل دوز مصائب اور شہید کربلا کے دل فگار سوانح کے بیان کے لیے یک گونہ مخصوص ہو کر غم و الم کی داستاں سرائی کے لیے خاص ہو چکا تھا۔ اس لیے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا، تو اس مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر

نہیں آئی، جس کا وزن ہی گویا درد وغم اور نالہ وماتم کی لے بن چکا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس نظم کے پراثر ہونے کے لیے ضرورت تھی کہ اس کے ہر ٹکڑے میں قابل بیان واقعہ ادا ہو جائے، مثنوی اس کے لیے موزوں نہ تھی، کہ اوّل تو وہ رزم و بزم کی حکایت کے لیے خاص ہو چکی تھی، اور پھر اُس میں اتنی سمائی نہیں ہو سکتی تھی، کہ اُس کے ایک ایک شعر میں تاریخ و سیر کا ایک ایک واقعہ ادا ہو جاتا۔ مسدس کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک ایک بند گویا کتاب کا ایک ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک ایک پیراگراف ہوتا ہے جس میں ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا جاتا ہے نظم کی رفتار پہلے مصرع میں تمہید، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں واقعہ کی تفصیل اور پانچویں اور چھٹے میں نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے چیز شروع ہوئی، کہاں تک اوپر چڑھی اور پھر کہاں سے نیچے اُتری۔ ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیل ذائقہ اور تجدید احساس کے لیے مستعد اور تیار رہتا ہے۔

اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف و شفاف نہر کسی ہموار اترائی میں آہستگی سے بہتی چلی جا رہی ہے نہ کہیں رُکاوٹ ہے، نہ لفظ میں گرانی ہے نہ قافیہ کی تنگی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے، ہماری زبان میں سہل ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے۔

شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی، وہ ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا، اُس کا مزاج سدا کا اُداس تھا، وہ عالم کی نیرنگی، زمانہ کی ناسازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی کے منظر دیکھ کر خود بھی اکثر روتا تھا اور دوسروں کو بھی رُلاتا تھا، وہ جب روتا تھا، اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا، کہ دیکھنے والے دیکھنے کی اور سننے والے سننے کی تاب نہیں لا سکتے تھے، مصنف کے سارے مرثیے خواہ وہ شخصی حیثیت سے لکھے گئے ہوں، یا قومی، اسی قدر پراثر اور کیف غم سے لبریز ہیں، اس انداز کا شاعر جب ملت مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ وجلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اُس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ، اور اُس کے لب کی ہر صدا فریاد کی ایک لے کیونکر نہ بن جائے گی۔

شاعر کو اپنی اس طبیعت کا کافی احساس تھا، دیباچہ اور ضمیمہ دونوں میں بار بار اُس کا یہ اقرار چھلکا پڑتا ہے، اس لیے مسدس کا اصلی حصہ جو 1296ء میں لکھا گیا تھا ایسے اشعار پر ختم ہوا تھا، جو

سرتاپا یاس اور نا امیدی سے بھرے تھے۔

ضمیمہ:

شاعر کو خود بھی خیال ہوا، اور دوسرے اصحاب نظر کے کہنے سے بھی معلوم ہوا کہ کسی ایسی کتاب کا جو قوم کو غیرت دلانے اور اُس کے احساسِ عمل کو جگانے کے لیے لکھی گئی ہو، ایسے دل شکن اور حوصلہ فرسا اشعار پر ختم کرنا ہمیشہ کے لیے اُس کی امیدوں کو منقطع اور اُس کے حوصلوں کو پست کر دینا ہے۔ چنانچہ چھے برس کے بعد 1303ھ میں شاعر نے اُس کا ضمیمہ لکھا اور چاہا کہ اپنی اُداس طبیعت کو اُبھار کر نوحہ خوانی کے بجائے کچھ رجز خوانی کا فرض انجام دے۔ مگر انداز طبیعت اور دلی یقین کے خلاف کوئی بات بنانا مشکل ہے، اس لیے اس ضمیمہ کی صورت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی غموں کا مارا ماتم گسار اپنے دوسرے غم زدہ عزیزوں کو تسکین دینے بیٹھے۔ وہ بار بار اپنے آنسوؤں کو پیتا ہے اپنے چہرہ کو مطمئن بناتا ہے اور دوسروں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے بھیگے رومال سے پونچھتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے اور پھر منھ پھیر کر اُن عزیزوں کی آنکھوں کو بچا کر اُسی رومال سے اپنے آنسوؤں کے قطروں کو بھی پونچھ لیتا ہے۔

اس ضمیمہ کی روانی اور فصاحت کا بھی وہی عالم ہے مگر ہر بند پر صاف نظر آتا ہے کہ مصنف وقت کی مصلحت اور طبیعت کے اقتضا کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اسی کشمکش میں اُس سے جہاں تک بن پڑتا ہے وہ اپنی قوم کے دل اُبھارنے، ہمت بڑھانے، اور ترقی کے گُر بتانے میں نئے نئے اسلوب پیدا کرتا ہے اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے۔

مسلمانوں کے علوم وفنون کی تاریخ اور ترقیوں کا یہ پہلا نقشہ تھا، جس کو مولانا حالی نے اپنے موئے قلم سے تیار کیا تھا، بڑے بڑے تاریخی واقعات اور قابل فخر کارناموں کو جس طرح چند مصرعوں میں کھپا کر انہوں نے بیان کر دیا، وہ آج بھی بے نظیر ہے۔

نظم کے ساتھ مقدمہ اور دیباچہ کی نثر بھی اپنی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے ہماری زبان کے ادب کا اتنا بلند نمونہ ہے، جس کی پیروی آج تک نہ ہو سکی۔

عبدالماجد دریابادی:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسمان پر

اکبر و اقبال کے دور سے قبل، اپنے شعر و تغزل کے وصف، آپ نے شاعر ہی کی زبان سے سن لیے؟ اپنی دو قرن قبل والی شاعری کا عکس آپ نے خود شاعر ہی کے آئینہ میں دیکھ لیا؟..... کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اُس ناپاک دفتر، کے کچھ اوراق، بطور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کیے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ و کبریٰ، قائم ہولیں اور انتاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے، جب جا کر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے؟

اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا، اور اس شان کا اس جمال کا اور اس کمال کا، اُردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟ جب اپنے 'آج' کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھیے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے: ؎

کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی — مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی
نہ گالی سے دشنام سے جی چرائیں — نہ جوتی سے پیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لچپن دکھائیں — جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش اُن کی ہنسی سے — گریزاں ہیں رند اُن کی ہمسائیگی سے

اور جب اپنے گزرے ہوئے 'کل' کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو اک دم ناصح ملامت گر سے شاعر رجز خواں بن جاتا ہے ؎

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحے کے اُٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دُور دُور اُس کی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی — ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی
کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں — مہیا کیے سب کی راحت کے سامان
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — اُنہیں کر دیا رشک صحنِ گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

خامیوں سے کون سی بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؟ کون سی آیندہ بچ سکے گی؟ نکتہ چینی پر

کوئی آجائے تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا؟ تو اس معیار کو تو خیر جانے ہی دیجئے حق و انصاف کی طرف آیئے تو خدا لگتی بات یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی؛ کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اُس کا مقصد تھا، اُس میں وہ مدتیں گزریں، کامیاب ہو چکا، اکبر اور پھر اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا۔ اس کے بعد مٹ گیا ہوتا۔ دُنیا اُسے بھول گئی ہوتی، جب بھی یہ اُس کی منفعت نہ تھی، عین فطرت کا تقاضا ہوتا۔

ضرورتِ دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا، سنت الٰہیہ میں داخل ہی کہاں ہے؟.....لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا، محض فضل اور محض انعام پر آجائے تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ جس کو جتنی چاہے دولتِ حیات سے سرفراز کر دے۔

عبدالرحمٰن خان شیروانی:

ہندوستان میں مسلمانوں کا دور جدید جن اسباب انقلاب کا منت پذیر ہے ان میں مسدس حالی بھی ہے مجھ کو وہ وقت خوب یاد ہے جب یہ مشہور مسدس پہلی بار شائع ہوا تھا مدح و ذم کا ایک طوفان اُٹھا۔ مداحین میں مرحوم سرسید بھی تھے۔ اُنہوں نے مدح اس بلند آہنگی سے کی۔ قیامت میں جب خدا تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا تو میں کہوں گا مسدس حالی۔ مخالف دو گروہ تھے۔ ایک قدامت کے شیدائی جن میں مذہبی خیال والے بھی شامل تھے۔ دوسرے لکیر کے فقیر شعرا۔ مسدس میں جن بے باکی سے ہم عصر مذہبی و معاشرتی طبقات پر جرح کی گئی تھی اس نے احساس مخالفت کو مشتعل کر دیا تھا خصوصاً مذہبی احساس کو۔ شعرا کو شکوہ تھا کہ مسدس کے قوافی وغیرہ میں ناموس شاعری کی اہانت کی گئی ہے۔ مخالفت کے لیے جب نثر کا میدان تنگ ہو گیا تو نظم کی باری آئی۔ مسدس کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے جن میں ایک میں ''مسدس خالی'' بھی تھا۔

جہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا وہاں حالی کا اخلاص بھی اپنا کام کرتا رہا بہت سے بند دلوں پر نقش ہو گئے، زبانوں پر چڑھ گئے، لوگ ان بندوں کو پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے، خصوصاً عروج و زوال مسلم کے بند یا وہ بند جن میں اندلس کا نوحہ ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اندلس سے یہاں کے مسلمان اسی جادو اثر کلام کی بدولت واقف ہوئے۔

ایک ''جنٹلمین'' جو شاید ہی کبھی شعر پڑھتے ہوں مسدس کے یہ بند ترنّم سے پڑھتے تھے اور

جھومتے تھے۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے

کچھ ہی زمانہ گزرا کہ مخالفت کی آندھی چھٹ گئی۔ اہل نظر نے دیکھا کہ مسدس اپنی جگہ پر ہے۔ ہوا صاف ہونے پر اُس کی مقبولیت بڑھی ان دلوں پر حاوی ہوئی جو حالی کا تصور بھی شاید داخل معصیت سمجھتے ہوں۔ ذکر مبارک کی مجلسوں میں مشائخ وعلما کو نعتیہ بندوں پر وجد کرتے دیکھا ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اُردو میں ایسا دلوں کو گرمانے والا نعتیہ کلام زیادہ نہیں ملے گا۔

خوبیوں کے ساتھ مسدس میں کمزوریاں بھی ہیں، خصوصاً جہاں سرسید کے وقتی خیالات کا اثر گہرا ہے۔

مولوی عبدالحق:

پچاس برس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میرے ایک ماموں فیروز پور (پنجاب) میں ملازم تھے اور فیروز پور سے قریب ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ یہ گاؤں انہیں کا تھا اور وہاں کے سب سے بڑے آدمی یہی تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے ختنے کیے اور اس رسم میں اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب کو مدعو کیا۔ یہ جشن بڑی دھوم دھام سے دو تین روز تک رہا۔ دوسرے دن کا ذکر ہے صبح کا وقت تھا، میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا، اور اُس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ مجمع شامیانے سے باہر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر اُس گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اٹھی۔ یہ لاہور سے بلائی گئی تھی۔ نام میں اس وقت بھول گیا ہوں۔ یہ اچھی پڑھی لکھی عورت تھی، شعر بھی کہتی تھی اور اُس کی غزلیں لاہور کے اخباروں میں چھپا کرتی تھیں، اُس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور یک بارگی مسدس (حالی) گانا شروع کیا ؎

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی، سناٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آبدیدہ تھے۔ وہ

سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے اور وہ گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

اب بھی جب کبھی میں مسدس حالی پڑھتا ہوں تو یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اِن اَن پڑھ اُجڈ گنواروں پر اس قدر اثر کیا کہ وہ آبدیدہ ہو گئے؟

ہندوستان میں ہر چیز آ کر ذات بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری کی بھی خاص ذات تھی۔ وہ مخصوص طبقے اور خاص لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور وہی اُس کے نکات سمجھ سکتے اور اُس کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ جو ذات سے باہر تھے وہ اکثر اس سے محروم رہتے تھے۔ حالی نے ذات پات کا یہ جھگڑا بالکل اُٹھا دیا اور اُس نے اپنا دردِ دل اُس زبان میں سنایا جسے اکثر لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ برادری سے خارج کر دیا گیا۔ شعر یا موسیقی ہے کیا؟ یہی نہ کہ ہم الفاظ یا آواز کے ذریعہ سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور لوگ اُسے پڑھ کر یا سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ دُکھ سے دکھی اور سکھ سے سکھی ہوتے ہیں۔ کیا کسانوں اور گنواروں کے دل نہیں ہوتا؟ کیا اُن میں عشق و محبت کا مادہ نہیں؟ کیا وہ دُکھ درد کا احساس نہیں رکھتے؟ کیا اُن میں ہمدردی اور ایثار نہیں ہوتا؟ رستم کی داستان یا حاتم طائی کا قصہ پڑھ کر سنایئے اور پھر اُن کے جوش اور ہمدردی کو دیکھیے لیلیٰ مجنوں کا ڈراما کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اُن کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اُن کے گیت سنے ہیں؟ کیا چیز ہے جو اُن میں نہیں ہے۔ شجاعت، عشق و محبت، ہمدردی، عصمت و عفت، غیرت، ظرافت سبھی کچھ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ آپ یہی چیزیں بیان کریں اور وہ نہ سمجھیں شرط یہ ہے کہ آپ کی زبان تکلفات لایعنی سے پاک ہو۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں۔

مسدس اس کسوٹی پر پورا اُترا، ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ بار بار چھپا اور اتنی بار چھپا کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو اور ہر طبقے میں مقبول ہوا۔

اس کی روانی حیرت انگیز ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کے لیے بھی کہیں رُکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی

کا یہ عالم ہے کہ اُس پر ہزار صنائع بدائع ظاہر سے قطع نظر کر کے باطن کو دیکھیے تو ایسی پُر جوش، ایسی عبرت انگیز اور سبق آموز اور دلوں کو اُبھارنے اور غیرت دلانے والی نظم ہماری کسی زبان میں نہیں مدو جزر اس کا بہت ہی صحیح نام ہے۔ شعر کی نسبت جو یہ کہا گیا ہے کہ اُسے حقیقت یعنی زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیے وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں ہمارے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حُسنِ بیان نے اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں آئیں اُخوت، ہمدردی، اتفاق، خودداری، حب وطن، جفاکشی، بے تعصبی وغیرہ سبق دیتے ہیں وہاں تیز نشتر بھی ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نشتر غم گسار سر جن کے ہیں نہ کہ بے درد و بد اندیش کے۔

مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔ ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔

سید سر راس مسعود:

خواجہ الطاف حسین حالؔی اُن چند بزرگوں میں سے ہیں جن کا اثر میرے قلب و دماغ کے ہر رگ و ریشے نے قبول کیا ہے۔ جب کبھی اُن کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے دو تصویریں پھر جاتی ہیں جن کا تعلق میرے بچپن کے زمانے سے ہے۔

ایک تصویر جو دکھائی دیتی ہے یہ ہے کہ علی گڑھ میں جون کا مہینہ ہے اور ہمارے غریب خانے میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں اور اس نیم تاریکی میں جہاں خس کی خوشبو کے ساتھ تمباکو کی خوشبو بھی ملی ہوئی ہے؛ مولانا مرحوم اور میرے والد ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور شعر و شاعری پر گھنٹوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ مولانا شرافت کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ہر ادا سے بلند خیالی اور میرے والد کے ساتھ سچی محبت ٹپکتی ہے۔ دونوں گفتگو میں اس قدر غرق ہیں گویا اس دنیا کو چھوڑ کر کسی اور دنیا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رات کا وقت ہے کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ ایک سرے پر میرے دادا مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کی داہنی جانب مولانا الطاف حسین مرحوم اور بائیں طرف میرے والد، قومی معاملات پر پُر جوش گفتگو ہو رہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے باتیں بند ہوتی ہیں اور میرے والد کے منھ سے یہ فقرہ نکلتا ہے۔ ''ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالؔی ہے۔'' میں دور کھڑا ہوا اس فقرے کو سنتا ہوں اور مجھ کو اکیلا کھڑا ہوا دیکھ کر میرے والد اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے قریب آؤں اور پھر حکم دیتے ہیں کہ ''جا الطاف حسین صاحب کے پاس کھڑا ہو جا!'' میں اس حکم کو بجالاتا ہوں الطاف حسین صاحب کمال شفقت سے مجھے سینے سے لگاتے اور پیار کرتے ہیں اس وقت میری عمر سات سال کی ہے۔ اس کے بعد میں زنانے میں اپنی والدہ کے پاس جاتا ہوں اور اُن سے پوچھتا ہوں کہ ''یہ کون صاحب ہیں جن کی پرستش کرنے کے لیے میرے والد صاحب تیار ہیں اور جنھوں نے مجھے پیار کیا ہے۔'' اس سوال کا جو مجھے جواب ملتا ہے اُس سے پہلی دفعہ مولانا مرحوم کی عظمت کا بیج میرے دل میں بویا جاتا ہے اور جب کبھی میں اُن کو دیکھتا ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں، باوجود اس کے کہ اب میری عمر تقریباً پچاس سال کی ہوگئی ہے میرے دل میں وہی عظمت ان کی ہے اور وہی محبت ان سے قائم ہے جو بچپن میں تھی۔

میرا عقیدہ ہے کہ اگر مولانا حالی مرحوم وہ بیش بہا ادبی خدمت اردو کی نہ کرتے جو انھوں نے کی، تو جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے وہ ختم ہو جاتی اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوتی جس کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہم یورپ کی شاعری کا مقابلہ کر سکتے۔ مسدس ہی میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر یورپ کی کسی قوم کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔ میرا اشارہ اُس حصے کی طرف ہے جہاں بغداد کے عروج کو بیان کر کے اُس کا زوال دکھایا گیا ہے۔ جب تک کہ اس دنیا میں ہماری مادری زبان رائج ہے، الطاف حسین حالی کا نام مٹ نہیں سکتا اور نہ اُس اثر میں کمی واقع ہو سکتی ہے جو اُن کے ذریعہ سے ہمارے ادب پر پڑا ہے۔ مولانا مرحوم کی نثر بھی

لا جواب ہے اور نظم بھی؛ دونوں میں وہ سادگی پائی جاتی ہے جو ہمیشہ سچے جذبات کی بہترین نشانی ہے۔

خواجہ غلام السیدین:

چیست انسانی تپیدن از تپ ہمسایگاں از سمومِ نجد درباغِ عدن پژماں شدن

اچھا شاعر ہونے کے لیے یہ 'انسانیت' ضروری ہے اور نجد و عدن کا امتیاز مٹانا لازم۔ حالی کو حساس اور دردآشنا دل ملا تھا اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ تربیت نے دین داری کو ان کی طبیعت میں راسخ کر دیا تھا۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے ماحول پر نظر ڈالی تو ایک عبرت خیز اور دردناک نقشہ نظر آیا۔ انہوں نے خود اس منظر کو ان الفاظ میں دکھایا ہے۔

''قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصّب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔''

یہی نقشہ تھا جس کو حالی کے خوں چکاں قلم نے مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سرا سر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پُھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں جہاں آ کے دیتا تھا رو ابرِ نیساں
تردد سے جو اور ہوتا تھا ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کیا حالی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ملت اسلامیہ کے اس اجڑے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گل وبلبل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے؟ بے شک ایسے شعرائے کرام بھی اس زمانے میں گذرے جن کے پاس آنکھیں تھیں، لیکن انہوں نے دیکھا نہیں، کان تھے لیکن سنا نہیں، دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا۔ قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ رومہ کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کیے۔ لیکن حالی کے دل ودماغ پر اس آگ کا دھواں چھا گیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد الطاف حسین حالی کا دل نہیں، بلکہ ایک قوم وملت ایک تہذیب وتمدن کا دل ہے، جو اپنی وسعت میں ایک جہانِ درد وآرزو کو لیے ہوئے ہے۔ حالی کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض اُن کے جذبات وکیفیات کا آئینہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج وزوال ہے۔

دوسری خصوصیت شاعر کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔ اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ ہی نہیں رکھا بلکہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے مناسب دوا بھی تجویز کی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑوں کی عقلیں یہاں جواب دے چکی تھیں۔ لوگ افراط وتفریط میں گرفتار تھے۔ بعض قدامت پرستی کے بندے، ماضی کے نشے میں سرشار یہ چاہتے تھے کہ جدید علوم اور تمدن کو بالکل مسترد کر دیں، بعض تہذیب مغرب سے مسحور ہو کر اپنی قومی روایات اور خصوصیات کو اُس پر قربان کرنے کو تیار تھے۔ اس نازک موقع پر حالی کی عقلِ سلیم نے شمع ہدایت کا کام دیا۔ انہوں نے ایک طرف مسدس میں مسلمانوں کو اُن کے عروج کی داستان سنائی اور اُن کی خودداری اور عزت نفس کو اُبھارا انہیں اسلام کے بھولے ہوئے اُصول یاد دلائے دوسری طرف مغربی تہذیب وتمدن کا جائزہ لے کر اُس کی اُن خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو مغربی اقوام کی ترقی اور فروغ کا باعث ہوئی ہیں ان کی حق پسندی نے اپنے تمدن کی برائیوں پر پردہ ڈالنا گوارا نہیں کیا اور نہ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں کوتاہی کی انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے آپ کو جدید ذہنی ہتھیاروں سے مسلح نہیں کریں گے کارزارِ حیات میں قدم رکھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کا سارا کلام خصوصاً مسدس جہاں دل درد آشنا کے لیے ایک مرثیہ کا حکم رکھتا ہے وہاں عقلِ سلیم کے لیے دعوتِ فکر اور سرچشمہ ہدایت ہے۔

اصلاحی نقطہ نظر سے سب سے اہم مسدس کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر نے قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے کی حالت کو اپنی بے پناہ اور دردناک تنقید کے ذریعے بے نقاب کیا ہے جس کے ہر شعر میں سوسائٹی کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ سرور کائنات کی بارگاہ میں عرض حال کرتے ہوئے چند اشعار میں وہ حقائق بیان کر دیے گئے ہیں جن پر مورخین معلمین اخلاق اور مصلحین معاشرت مدتوں سر دھنیں گے۔ اس درد بھری، دل دوز نظم میں سے کوئی کیا سنائے اور کیا چھوڑے۔ مثال کے طور پر چند شعر سن لیجیے۔

اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے — اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے — اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اُس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی — اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی — منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں — پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے — ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

صرف اسی نظم کی تنگ زمین میں حالی نے اُن مقامات کو بیان کر دیا ہے جہاں مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے مدعی نہیں پہنچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کے رخ روشن پر، زمانہ کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردے کو اُٹھا کر دکھا دیا کہ اسلام ایک مذہب امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقر میں خودداری اور جدوجہد اور ثروت میں فیاضی، خدا ترسی اور حق شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اب خود ملت اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں حسن مراعات کا نام تک باقی نہیں رہا۔ عمل کی سرگرمی کی جگہ جمود اور

بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منعم اپنی دولت میں مست ہیں اور مفلس خودداری کو چھوڑ کر ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ نہ اُن میں قوت عمل باقی رہی ہے نہ ان میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں، خدا کے ہاں انصاف ہے پاس داری نہیں، جو قوم اس کے احکام اور قوانین کی پیروی نہیں کرے گی وہ اس کا خمیازہ اُٹھائے گی۔ اس میں تقدیر کا گلہ کرنا، اپنے نفس کو فریب دینا اور حقیقت کی تلخی سے گریز کرنا ہے۔

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے

تمدن و معاشرت کے تمام مختلف فیہ مسائل میں حالی ہمیشہ اُدھر ہوتے ہیں جو عدل، انسانیت اور انصاف کا رستہ ہے۔ وہ حق پرستی، انصاف پسندی، خودداری، جرأت، بلند حوصلگی اور رواداری کے حامی ہیں اور وقت کی قدر کرنا، محنت کی عزت کرنا، ابنائے جنس کے حقوق کی پاس داری کرنا اور مفاد ملی کے لیے ذاتی اغراض کو قربان کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کا امکان پوشیدہ ہے جس کو اُن لوگوں نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا جو ان کے کلام پر سر دُھنتے ہیں اور ان کا قومی مرثیہ پڑھ کر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ صرف قوم کا دل دھڑکتا ہے بلکہ اس کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کی شان میں جو شعر لکھا ہے اُس کا اطلاق بدرجہ کمال حالی پر ہوتا ہے۔

حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن دل انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

حالی کی مصلحانہ حیثیت کی سچی قدر شناسی کے لیے ان کی بلند اور پاکیزہ سیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے آدمی گذرے ہیں جن کا نام لوگوں کی اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، لیکن باوجود ان کے بڑے بڑے کارناموں کے ان میں کم ایسے ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن، قول و فعل، اُصول اور عمل، زندگی اور تعلیم بالکل ایک ہوں۔ حالؔی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی ایک بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا ان میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر لفظ جو دل سے نکلتا ہے بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔ سید کے حلقہ احباب اور رفقا میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی، جس پر تبصرہ

کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے عصر جدید میں لکھا تھا ''بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا یونانی خیال کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان، اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔

ان ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا تذکرہ غیر متعلق یا خارج از بحث نہیں، کیونکہ حالی کی ذات اب انفرادیت کی حدود توڑ کر ہماری تہذیب وتمدن اور ہماری تاریخ وادب کے سرمایہ عزیز میں سما گئی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کی قدر شناسی کے لیے ان نفسی خصوصیات اور محرکات عمل کو پہچاننا ضروری ہے جنہوں نے حالی کو حالی بنایا حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا جذبہ اور خدمت خلق کا شوق اُن کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر محیط تھا۔ اس نے ان کو غم عشق اور غم روزگار دونوں سے آزاد کر کے قوم کے غم اور قوم کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی جذبہ اصلاح تھا جس نے ان کی زندگی کی ابتدا سے رہنمائی کی اسی کی بدولت انہیں مسدس کے مضامین کا الہام ہوا۔

آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گامزن ہیں، حالی کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتی ہے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے۔

نگہ بلند ، سخن دل نواز ، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

عابد حسین:

حالی کا نخل طبع دور تنزل کی بنجر زمین میں اُگا مگر اُس کی آبیاری میر و درد کے رشحات فیض نے اور اُس کی پرداخت غالب و شیفتہ کے دست شفقت نے کی۔ حالی کی ابتدائی عمر کی غزلوں میں زمانے کا رنگ نظر آتا ہے مگر وہ ستھرا رنگ جو ارباب صفا کے ایک چھوٹے سے حلقے میں محدود تھا۔ ان کی صحت ذوق اور صلاحیت مزاج کا اندازہ اُن نظموں سے ہوتا ہے جو انہوں نے لاہور کے جدید طرز کے مشاعرے کے لیے لکھیں۔ ''برکھا رُت''، ''نشاط اُمید''، ''مناظرہ رحم وانصاف''، اور ''حب وطن'' جیسی نظموں کا ایک ایسے شاعر کے قلم سے نکلنا جو ابتدا سے غزل کہنے کا عادی تھا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کی اپج خود ہی رسمی شاعری کی کال کوٹھری سے اُکتا گئی تھی اور اپنے لیے ایک وسیع تر اور روشن تر جولاں گاہ ڈھونڈتی تھی۔

پھر بھی جب تک جوانی کی شوریدہ سری باقی رہی انفرادیت اور داخلیت کی قید سے رہائی نہیں ہوئی کیونکہ جوانی نام ہی اس کا ہے کہ انسان دل کے کونوں کوٹٹولتا، نفس کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا پھرے۔

اس چکر سے نکلنے کے بعد ردِّعمل کا دور آیا۔ چالیس برس کی عمر میں حالؔی کی طبیعت پر افسردگی اور مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ممکن ہے اس میں دنیاوی افکار و آلام کو بھی دخل ہو مگر اصل وجہ یہ ہے کہ حالؔی کی نظر جسے ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو رہا کرتی تھی اس جگہ پہنچ کر ٹھہری جہاں سے انہیں اپنی گذری ہوئی شاعری نکمی اور بیتی ہوئی عمر اکارت دکھائی دینے لگی۔ اس پر طرہ یہ کہ تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ دل سوز وطن سے آشنا ہو چکا تھا مگر وطن اور اہل وطن کی حالت اور بھی زیادہ مایوس کن اور دل شکن تھی۔ جو نا اُمیدی کے بوجھ سے دبا ہو رجز خوانی تو ایک طرف نوحہ خوانی بھی نہیں کر سکتا۔

یکا یک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی روشنی چمکی۔ سرسید احمد خاں نے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے سب سے بڑے مدبر تھے، 57ء کے ہنگامے کے بعد تمدن کے بکھرے ہوئے اجزا کو ''قومیت'' یا ''ملیت'' کی تحریک میں سمیٹنے کی کوشش شروع کی۔ سرسید کی ذات میں حالی کو وہ رہنما مل گیا، قوم کے تصور میں وہ منزل مقصود اور قومی تعلیم کی تحریک میں وہ راہِ عمل نظر آ گئی جس کی انہیں تلاش تھی۔ اب کیا تھا ان کے رندھے ہوئے دل میں نئے ولولے اُٹھنے لگے، بجھی ہوئی طبیعت میں نئی آگ بھڑک اُٹھی۔ انہیں ایک مقصدِ حیات ہاتھ آ گیا اور وہ یہ تھا کہ ادب و شعر میں وہی انقلاب پیدا کر دیں جو اُن کے مرشد نے تمدن و معاشرت میں برپا کیا تھا۔

اس عزم کا پہلا نتیجہ مسدس مدوجزر اسلام تھا جو سرسید کی فرمائش سے 1879ء میں لکھا گیا۔ اس میں شعر حالی کے دوسرے دور کی کل خصوصیات موجود ہیں۔ افرادیت کا توڑ تو اُس کا موضوع اور مقصد ہی ہے۔ داخلیت سے بچنے کا اس قدر اہتمام ہے کہ بجز ودیاپتی کے شاعر نے اپنی ذات کو کہیں جھلکنے نہیں دیا۔ تخیل ہر قدم پر مشاہدے کا پابند ہے۔ نظم کا تار و پود صحیح تاریخی حالات اور نفس امری واقعات سے تیار ہوا ہے۔ اسلام کی گذشتہ عظمت کے دکھانے میں جہاں عقیدت تخیل کو ایڑ لگاتی ہے وہاں دیانت اُس کی باگیں کھینچے ہوئے ہے جذبات کی شدت کو ضبط نے قابو میں رکھا

ہے۔ البتہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کے بیان میں تلخ نوائی سے چارہ نہ تھا۔ یہاں دل کھول کر نشتر ملامت کے چبھو کے دیے ہیں خصوصاً شاعروں کی ہجو میں بڑی سختی سے کام لیا ہے شاید اس وجہ سے کہ یہاں ملامت غیر نہیں بلکہ ملامت نفس مقصود تھی۔ اس کے باوجود الفاظ کی سختی سے قطع نظر کر لیجئے تو واقعات کے بیان میں یہاں بھی اصلیت سے انحراف نہ پائیے گا۔ مبالغہ جو دوسرے شاعروں کی دال روٹی ہے حالی کے یہاں اتنا ہے جتنا کھانے میں نمک اور اسی قدر لطف دیتا ہے۔ شاید آپ کو حکومت وقت کی برکات کے بیان میں بے جا مبالغہ نظر آئے لیکن ان آنکھوں سے دیکھئے جنہوں نے مدتوں کے فتنہ وفساد کے بعد پہلے پہل امن کی صورت دیکھی تو آپ کو بھی وہی دھوکا ہوگا جو حالی کو ہوا۔

بیان کی سادگی اور صفا کی زبان کی سلامت ونرمی اور گھلاوٹ، حالی کا حصہ ہے اُردو زبان کے پودے کو علمیت بگھارنے والے اس ڈھب پر لا رہے تھے کہ اپنی زمین چھوڑ کر عربی فارسی کے تناور درختوں کا طفیلی بن جائے۔ حالی کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں کہ انہوں نے اسے جڑ سے مضبوط کر کے اپنے بل پر پنپنے اور بڑھنے کے قابل کر دیا۔ ہندی کے سہل اور نرم الفاظ جو اُردو میں کھپ سکتے تھے، گھریلو محاورے جو بول چال میں رائج تھے مگر تحریر میں نہیں آتے تھے، حالی کے ٹھپے سے نظم ونثر میں چلنے لگے۔ اس زبان کے اختیار کرنے میں ادبی مصلحتوں کے علاوہ جمہوریت اور مساوات کے جذبے کو بھی دخل ہے۔ حالی کا خطاب کسی ایک طبقے سے نہیں بلکہ ساری قوم سے ہے اور قوم کا مفہوم اُن کے ذہن میں اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا جو ان کے ہم عصروں کے ذہن میں تھا۔ حالی کی قوم میں صرف ''شرفا'' نہیں بلکہ غریب، امیر، چھوٹے بڑے، عالم جاہل، سب داخل ہیں اس لیے انہوں نے اپنے خیالات سیدھے سادے طریقے سے سلیس اور عام فہم زبان میں ادا کیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مگر اسے شاعری کا کمال کہیے یا سچائی کا جادو کہ اسی کھرّی اور کڑوی نظم میں وہ زور وہ لطف وہ اثر پیدا ہو گیا جو انسان کے کلام میں بہت کم ہوتا ہے۔ حالی سمجھتے تھے کہ یہ ''اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن''، ''جس میں نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی'' خوش خوراکوں کے حلق سے نہیں اُترے گا اور انہیں تعجب ہوا کہ ''تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل

گئی.....لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو بہاتے۔

رام بابو سکسینہ:

''مسدس حالی'' کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایک الہامی کتاب قرار دیتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

''مولانا حالؔی کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارا ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا۔ اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت مسلمانان سابق کے کارنامے ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے زمانہ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو اُن کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں۔

''زمانہ حالی کی کوئی اردو کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے۔ یعنی اچھائیاں زمانہ گذشتہ کی اور برائیں زمانہ موجودہ کی۔

رشید احمد صدیقی:

اُردو کے بلند پایہ نقاد اور صاحب قلم انشا پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں: ''حالؔی اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس بستی اور غفلت کے شکار نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب و مطالبات سے دوچار یا غافل تھے، ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھاتے اور

حوصلہ دلاتے ہیں حالؔی نے مسلمانوں کو ''مسدس حالی'' اور ''شکوۂ ہند'' میں ان کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تحریروں اور تقریروں میں حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دل سوزی اور دلیری سے تلقین کی ہے، ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔''

صالحہ عابد حسین:

مسدس کی اس درجہ قبولیت کی ایک بڑی وجہ تو اس کی حقیقت نگاری، صداقت، خلوص اور وہ دردوسوز ہے جو اس کے ہر ہر شعر میں جاری وساری ہے۔ دوسری وجہ زبان و بیان کی سادگی، روانی، شیرینی اور وسعت ہے۔ حالؔی کا پیام قوم کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نام نہ تھا اس لیے وہ اُسے کسی خاص اصطلاحی اور مشکل زبان میں ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کو تو پوری قوم کو اپنا پیام پہنچانا تھا خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لیے انہوں نے وہ زبان استعمال کی جسے ہر کس و ناکس آسانی سے سمجھ سکے۔ ''بیان کی سادگی اور صفائی، زبان کی سلاست اور نرمی اور گھلاوٹ حالؔی کا حصہ ہے۔'' انہوں نے وہ الفاظ اور محاورے جو ادب میں متروک اور گھٹیا سمجھے جاتے تھے لیکن روزمرہ کی زبان میں انہیں قبولیت حاصل تھی بے تکلف استعمال کیے اور اس خوبی سے کہ جو لفظ جہاں بٹھا دیا گیا وہاں نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق کے ''زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو مسدس حالؔی صرف اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر ہی سے ایک بالکل جدید طرز کی چیز نہ تھی بلکہ حقیقت میں یہ ترقی پسند ادب اور نئی شاعری کا سنگ بنیاد تھی۔ جس تحریک کو ہم ترقی پسند تحریک کہتے ہیں، دراصل آج سے ستر سال پہلے حالؔی نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اگر آج ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے رنگ میں لگی ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پون صدی پہلے بھی اس صورت میں یہ تحریک اٹھائی جا سکتی تھی۔ حالؔی نے صرف ترقی کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ دراصل ایک انقلاب کی بنا ڈالی۔ انہوں نے صرف شعر کی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کیا بلکہ شعر کے ذریعے انسانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں بھی انقلاب کا بیج بویا۔ ہاں حالؔی تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرسودہ عمارت کے پرانے مسالے سے ایک نئی اور پائدار عمارت بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے بعض نقاد بڑی بے تکلفی اور ''بے غوری'' سے آج کے معیاروں پر انیسویں صدی کے شعر و ادب کو پرکھتے ہیں اور جب پرانی اصلاحی اور انقلابی چیزیں اُن کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں تو بے تکلف اُن کو

کھوٹا سونا قرار دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ سانچے، یہ معیار بہت بعد کے بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سماجی اور سیاسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ حالؔی دراصل اپنے زمانے کے انقلابی، اور ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ ہاں اُن کا معیار جدا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ حالؔی کہتے ہیں:

''جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیہ اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوبِ بیان میں مطلق فرق نہ آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجو، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے ..... نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔.....'' اس لیے حالؔی نے معنی کی نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں یا اُن سے ملتے جلتے پیمانوں میں پیش کیا اور اس طرح قبولیت کی راہ میں غیر ضروری اُلجھنیں نہیں پیدا کیں۔

مسدس میں بعض مقامات اپنی جگہ اتنے پُر اثر، دلکش اور فنی اعتبار سے لاجواب ہیں کہ وہ اردو ادب کے لیے ہمیشہ سرمایہ افتخار رہیں گے۔ پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ ﷺ کی نعت میں شاعروں نے گزشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا لیکن مسدس میں جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں۔

یہ آخری ریمارک غور کے قابل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالؔی کے پیش نظر مسلمانوں کی حالت زار تھی اور اُن کی اصلاح ان کا مقصد اوّل تھا۔ لیکن وہ اُن کے عروج و زوال کی جو داستان پیش کرتے ہیں وہ تاریخ عالم کا ایک روشن اور عبرت انگیز حصہ ہے اور اس کا مطالعہ انسان کی تہذیبی میراث کا جز ہے، جو صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سب قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ قومی عروج و زوال کے جو اصول اور اسباب اس میں سمجھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عام

ہے۔اس کے علاوہ جن قدروں کو انہوں نے پیش کیا ہے اور جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بھی زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔محنت، اکل حلال، دیانت داری، اخوت، انصاف، سماجی برابری، علم کا احترام، دولت اور نام ونسب کی بے جا پاس داری کے خطرے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر قوم کے لیے ضروری ہے۔اگر ان کو کسی خاص قوم یا مذہب کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے (اور برخلاف اقبالؔ کے حالیؔ کے ہاں تو اصطلاحیں بھی بہت کم ہیں اور ان کی شاعری کی زبان ایک عالمگیر زبان ہے) تو اس سے ان کی قدریں کم نہیں ہو جاتیں۔

Syeda Saiyidain Hameed:

Musaddas-e-Hali is not an account of the rise and decline of Muslim empires—a process which spanned over seven hundred years. The poem is first an account of Jahilliat and then of the revolutionary change the Prophet brought about in the character of the Arabian tribes. Hali is not talking about politics or empires but about the individual Muslim of his daily life, toils and troubles. It is an account of how he has deviated from the essential teaching of his religion. In the poem when he describes the grandeur and beauty of monuments if Islam, such as the mosque Qartaba (Cordova) and the palace Alhamra, both in Spain, it should be taken as praising architectural and aesthetic achievements:

Let someone explore the relics of Cordova
The arches and portals of mosque lying in ruins
Hejazi palaces which sparkled like Nova
The rise and the fall of Khilaafat's strongholds
In debris thus shine their visages, I am told
As in dust there glitters fine silver and gold.

He does not applaud the political power or conquests of

the Muslims nor urges them to rise as great military people. His concern is about their character as indivduals and as a community. It is their scholarship, their arts and sciences, their poetry and literature, in short, their civilizin influence over the world, which he extols. What Hali lauds is not the glory of Islam's temporal empire but its spiritual dominion in transforming the Arabs into people of high moral character. By accepting the Islamic faith Hali believes that pagans and beasts were turned into true human beings:

The Din which transformed enemies into brothers
The savage who swore by the sword learnt to love
Even predators it taught to care for the others
To shepherds which gave the control of the world
The land which was grazeland for cattle and bare
Was turned gold and treen so the world it colud dare.

After describing the spread of Islam through the Islamists who went far and wide to found new civilizations, the poet goes on to the next phase. This is the story of decline and fall, which starts one-third way into the poem, with the famous line-Pa gadla bua jab ke chashma safa ka (When muddy became the crystal waters).

In this part the poet describes Islam as a 'ruined garden' and states how the Muslims themselves are to be held responisible for their condition. He holds up a mirror for the Quom to see, recognize and wince at its state. No words are spared to show the Quom what it was once and to what depths it has sunk. It touches upon all aspects of life, work and human relationships. The reduced circumstances and

poor condition of Indian Muslims is described. Never having bothered to acquire English education, their marginalized status during the colonial regime at the end of the nineteenth century is described in verse after verse.

Here one may digress to explain what Hali means by Quom, the word which occurs most often in the poem and wich has been left as is in the translation because it has no equivalent in the English language. Originally Hali had used the word for the people of Arabia, whom the Prophet had addressed when he emerged from the Cave of Hira and declared his Prophethood. Later he uses the word for the Muslims among whom he lived. Hali did not use the word Quom in the sense of a people living in a specific territory and professing allegiance to the land, as a modern nationalist would do for his Nation-stae. He did not use it in the sense Jinaah and Gandhi used it. Teli, tanboli, mughal, patahn, syed, gujjar, jat, Hindus, Muslim, Sikhs, scores and scores of them were called Quom in India.

Hali's dirge is only for the Muslims of India who, by the end of the nineteenth and beginning of the twentieth century, had become a confused, rudderless Quom. His reformist Zeal did not extend to other religions; perhaps because he was a deeply religious man who did not want to pass judgment over the people of other..... religions and declare whether or not they were conforming to the tenets of their own faiths. Perhaps also because he wanted others to learn the best from their own faiths. It is interesting to juxtapose Hali's use of literature as a vehicle of reform with

the other great literary (and political) gaint of the period, another man whose name bears the prefix Maulana. He was Maulana Abul Kalam Azad whose early writings coincide with the last decade of Hali's life. In his earliest journal, Lisan-us-Sidq (Voice of Truth), begun in 1903, he voices the same sentiment and lament for the Muslims. Like all Muslim youth, Musaddas was part of his upbringing as well.

In a manner reminiscent of Jonathan Swift, the great satirist of the seventeenth century whose work Hali may have read, Hali spares no one for the condition of his Quom, least of all the Muslims themselves. He chastises the religious leaders who have abdicated the responsibility of their calling. He condemns dogmatism, obscurantism and bigotry, which have become the hallmark of those who profess to be Islam's custodians. He attributes the decline of Muslims to the stifling of dissent, curbing of questions and allowing of religious ritulas to take precedenc over the spirit of the religion. The poet has no hesitation in upbraiding members of his very own tribe for their mediocrity and profligacy in misleading the Quom through their writings. He hauls up the inferior poets who preen themselves before the muse. He is unsparing towards those who excel in convoluting and complicating religion so that it goes out of reach of the common person. The Prophet himself had declared, Al Din Yusrun, meaning 'Din is easy', but the 'learned' have so negated his words that people begin to feel that Din is nothing but a burden. The poem concludes with a warning to Muslims to repair their ship before the storm wrecks it to peices.

The whiplash of Hali's verses struck deep at the Quom. Later in this Introduction, I have described the Public reaction to Hali's poem, from intensely emotional to laudatory to condemnatory. It shook its readers and made them look within to identify the malasie. Today, 150 years later, we Muslims need the same introspection; first to be reminded, then to be chided and finally to be shown the Siratul Mustaqeem (Straight Path). This was the crux of Musaddas. And this became for me the overwhelming reason for undertaking this work.

مالک رام:

یہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو شاعری ابتدا ہی سے اپنے محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکی۔ حالؔی عرصے دراز تک اس سے مطمئن نہیں رہے۔ ان کے ذہن میں اردو شاعری میں اصلاح کے بہت سے طریقے تھے تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جا سکے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں محمد حسین آزاد نے جو مشاعرہ منعقد کیا تھا اس میں حالی بھی شریک تھے۔ اس مشاعرے سے پرانی شاعری کی اصلاح کے کئی طریقے سامنے آئے مگر کوئی صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ حالؔی نے اپنی بے چینی، کرب اور ذہنی کشمکش کا اظہار تفصیل سے مسدس حالؔی کے دیباچے میں کیا ہے۔ خوش قسمتی سے دلّی آنے کے بعد حالؔی کی ملاقات ایک مرد دانا سید احمد خاں سے ہوئی جس کے دل میں قوم کا درد تھا اور جو مسلمانوں کا سچا ہمدرد تھا یہ وہ مرد بزرگ دانا ہے جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگایا تھا۔ حالؔی ان کی سیرت اور بلند خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور دل و جان سے سرسید کے ساتھ ہو گئے۔ سرسید کے دل میں مسلم قوم کا درد بہت تھا اور وہ قوم کی خواہشوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے، قوم کو پستی سے نکالنے کا واحد ذریعہ تعلیم تھا اور اسی کے ذریعہ قومی جذبے کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جو قوم کو ترقی کی طرف لے جا سکتا تھا۔ سرسید آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ مختلف سوسائٹیاں اور ادارے صرف اسی مقصد کے لیے قائم کیے جائیں اور اس کو با مقصد بنانے کے لیے اخبارات و رسائل

نکالے جائیں تا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلائی جا سکے اور وہ پستی سے باہر نکل سکیں۔ چنانچہ سرسید نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے 1875ء میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو بعد میں ترقی کر کے یونیورسٹی ہو گیا۔

سرسید کے تعلقات اس زمانے کی بڑی بڑی عظیم شخصیتوں سے تھے ان میں بیشتر ان کی پالیسیوں کے ہم نوا تھے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ان کے بلند حوصلوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے البتہ ایک حالؔی کی شخصیت ایسی تھی جس نے سرسید کے دکھ کو سمجھا اور ان کے بلند حوصلوں پر مرہم رکھا اور انہوں نے مسلم قوم کو پستی سے باہر نکالنے کا ذریعہ تلاش کر لیا۔ سرسید نے حالؔی سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ حالؔی نے قومی جذبے سے سرشار ہو کر قوم کو بیدار کرنے کے لیے ''مدو جزر اسلام'' (اسلام کا عروج و زوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدس حالی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نظم سب سے پہلے جون 1879ء کے شروع میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت سے مسلم قوم میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ نظم میں حالؔی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک سچے اور مخلص شاعر کے دل کی آواز کو درد آشنا انسانوں نے سمجھا اور اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دی۔ سرسید نے جب اس نظم کو پڑھا تو ان کے دل پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے بڑے دل کش انداز میں حالؔی کے اس غیر فانی کارنامے کی داد دی۔ زبان سادہ سلیس اور دل نشیں ہے۔ روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ نظم کے بہت سے بند ایسے ہیں جو بغیر چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ نقادوں نے بھی حالؔی کی اس نظم کی بہت تعریف کی ہے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کا تیسرا اڈیشن 1886ء میں جب شائع ہوا تو حالؔی نے اس میں 162 تازہ بند نظم کے آخر میں اضافہ کیے اور سرسری ترمیم و اضافہ کیا۔ یہ اڈیشن بہت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ اس کی حقیقت نگاری ہے۔

آل احمد سرور:

مسدس کے بارے میں تنقیدی اشارے میں کہتے ہیں: حالی کی سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے، مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی اور سرسید اُسے

اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی پستی سے نجات ملی۔ یہ نظم اپنے طرز کی انوکھی اور نئی ہے اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے۔ اس میں حالؔی نے قوم کا مرثیہ لکھا ہے مگر مرثیہ میں تعمیری شان ہے۔ جہاں اس میں شرفا کی حالت، شعرا کی پستی، علم عمل کے فقدان پر ماتم ہے وہاں ماضی کی شان وشوکت کا وہ ولولہ انگیز تذکرہ ہے جسے پڑھ کر مایوس سے مایوس دل بھی گرما جاتا ہے۔ مسدس میں کئی مقامات ہیں جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں عرب کی جہالت اسلام سے پہلے، نبی برحق کا نزول، ان کی سیرت، ان کی تعلیم ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبہ اسلامی، مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری، قرطبہ اور بغداد کی عظمت، سب کا ذکر سادہ مگر بڑے پراثر الفاظ میں ہوا ہے۔

حالؔی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں پھر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم بیدار ہو جاتا ہے، وہ ماضی کے شاعر کہے جاتے ہیں، مگر ماضی کی یاد میں کھو جانا ان کا شیوہ نہیں۔ ماضی کی ہر تصویر عبرت کے لیے پیش کرتے ہیں نہ کہ عشرت کے لیے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

مسدس کے بارے میں تجزیے اور روایت میں لکھتے ہیں:

حالی کی مسدس اردو میں قومی شاعری کی پہلی بلند آواز ہے سیاسی شعور اس سے پہلے بھی شعرا کے کلام میں موجود ہیں۔ غزلوں ہجویات اور شہر آشوب میں اس کی جھلک موجود ہے نذیر کے یہاں تو یہ شعور نہایت واضح ہے لیکن حالی سے پہلے اس کا مقصد اتنا واضح اور متعین نہیں ہے سبب اس کا یہ ہے کہ حالی کا یہ مسدس سرسید کی تحریک کا ایک جزو ہے۔ سرسید کی تحریک بڑی ہمہ گیر اصلاحی تحریک تھی۔ مذہب معاشرت، تعلیم، شعر وادب، انشا اور صحافت سب اس کے حلقے میں آتے تھے سرسید کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان نئے بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکیں ان میں جدید تعلیم اور روشن خیالی پھیلائی جائے، پرانے رسم و رواج، بے ہودہ تقلید اور رواج پرستی کی بیخ کنی کی جائے۔ جھوٹ، خوشامد، تصنع اور تکلف کا خاتمہ کیا جائے، اخلاق سدھارا جائے قوم اور قومیت کا تصور پیدا کیا جائے اور قومی عزت اور عزت نفس کی تعلیم دی جائے، سرسید کی اس ہمہ گیر تحریک میں

ان کے بہت سے شریک کار اور رفیق تھے انہیں میں ایک حالی بھی تھے، مسدس ایک اصلاحی نظم ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو ان کے ماضی اور حال کی داستان سنا کر ترقی کے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ کرنا تھا، اس نظم میں بڑی حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کا ثبوت دیا گیا ہے اس میں مروجہ اسلوب سے انحراف کر کے صفائی، سادگی اور سلاست پر زور دیا گیا تھا۔ اسی لیے لوگوں کو جو تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے عادی تھے حالؔی کا یہ نیا اسلوب بڑا روکھا پھیکا نظر آیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک حالی کی شاعرانہ زندگی مسدس کہنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس نظم کو محض ایک قومی مرثیہ اور پھیکی نظم کہتے ہیں لیکن حالی نے جو راستہ دکھایا تھا اسی پر اکبر، چکبست، اقبال اور جوش سے لے کر فیض احمد فیض تک گامزن ہوئے ہیں۔

جلیل قدوائی:

مسدس حالؔی، مولانا کی بہترین مسلسل بیانیہ نظم ہے۔ اس میں حالؔی کی شاعری کے تمام ظاہری اور باطنی اوصاف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں، صاف، سادہ، رواں اور مبالغہ سے پاک یہ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے جلال اور گزری ہوئی عظمت اور بیتی ہوئی زندگی کی نہ صرف خونچکاں تاریخ ہے بلکہ ان کے زوال کا مرثیہ بھی ہے۔ شاعر نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ اسلام کے عروج و زوال کی تصویر کھینچی ہے اور زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر حصے میں مسلمانوں نے جو نمایاں خدمات سرانجام دیں، علوم و فنون میں جو مستقل اضافے کیے، تمدن و سیاسیات میں جو غیر فانی نقوش مرتسم کیے۔ معاشرت و اخلاق میں جو یادگار ابواب قائم کیے۔ شعر و ادب میں جن وسعتوں اور بلندیوں کو راہ دی ان سب کو انتہائی جوش فخر اور درد کے ساتھ بیان کیا ہے اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی خدمات جلیلہ پر جس جس طرح پانی پھیرا تھا اور اسلام کے نام کو دھبہ لگایا تھا اس پر دل کھول کر اور نہایت سختی سے طنز اور نکتہ چینی بھی کی جس سے بعض لوگوں نے برا مانا۔ یہی وجہ تھی کہ چند سال بعد مولانا حالؔی نے مسدس کے آخر میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں امید سے خطاب کیا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اربابِ وطن پر یہ صاف واضح ہو جائے کہ اسلام کے عروج و زوال کے بیان سے مقصد رونا رلانا نہیں، بلکہ اس بگڑے ہوئے گھر کو پھر بنانا اور اس خرابے کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جیسے خشک موضوع میں جو واقعات وحالات کے بیان تک محدود ہوتا ہے شعر وشاعری کی نزاکتیں اور زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کر دینا ایک بے جان چیز میں جان ڈال دینا صرف حالی کا کام تھا۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حالی نے اپنے عقیدہ کے مطابق سارے مسدس میں کہیں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا، صداقت وراست بازی سے جوان کی زندگی اور شاعری کا جوہر تھا سرِ مُو تجاوز نہیں کیا اور اپنی نظم شاعری کے مقررہ اصولوں سے ہٹ کر اور مروجہ قواعد سے انحراف کر کے مرتب کی جس کے لیے وہ بہت بدنام بھی ہوئے اس وقت اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس نظم میں یہ درد واثر، روانی وترنم اور تسلسل وشگفتگی کس طرح پیدا کر سکے۔ شاید مسدس کے موضوع ہی میں یہ تمام صفات موجود تھیں۔ اس نظم کے بعض بند بغیر پُر آب آنکھوں اور گلوگیر آواز کے پڑھے نہیں جا سکتے۔ زوال بغداد اور تعمیر بلاد کے بند پڑھ کر آنکھوں کے سامنے ایک سماں پھر جاتا ہے اور دل پر تصویر اُتر آتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ چند مصرعے لطف بیان اور نزاکت تخیل پر آخری لفظ ہیں ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

ع ٹپکتی ہے قادیس سے حسرت ان کی

ع نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا

ع خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

اور اسی باغ رعنا سے بو ان کی پھوٹی

اگر شاعری اور تخیل کی معراج نہیں ہے تو مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ شاعری کس چیز کا نام ہے!

نعت پیغمبر اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے بیان میں رسمی شاعری کے خلاف صرف ان کے اخلاقی اور روحانی اوصاف نمایاں کیے گئے ہیں مگر کون ہے جو ان اشعار کو پڑھ کر اس ذات اقدس پر اپنی روح فدا کرنے اور اسلامیوں کے نام پر آنسو بہانے کو تیار نہ ہو جائے۔

مسدس کا شائع ہونا تھا کہ شعرا کے اس طبقہ نے جو رسمی اور تقلیدی شاعری کا اجارہ دار تھا اور جس کے کان نغمہ کی اس نئی لے سے نامانوس تھے اس کے خلاف ایک طوفان بپا کر دیا۔ اس کی زبان اور انداز بیان پر نکتہ چینیاں ہوئیں۔ اس کی نقالی کی گئی۔ ''مسدس خالی'' تصنیف ہوا، ملک

کے رسائل میں مسلسل اختلافی مضامین شائع ہوئے۔

مسدس کی ادبی حیثیت پر جتنے اعتراضات ہوئے ہیں۔انہوں نے ایک تاریخی حیثیت اختیار کر لی ہے۔مگر ایک بے لاگ نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اُردو کے اہل زبان ادب اور تنقید کے مفہوم سے بہت دور جا پڑے ہیں۔آرٹ کا مقصد بقول شلر ''زندگی میں لطف پیدا کرنا ہے'' اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلی اور بڑی شرط اس امر کی ہے کہ آرٹ ناظر کی سمجھ سے باہر نہ ہو بلکہ پوری طرح سمجھ میں آئے پھر اگر زیادہ سے زیادہ ناظرین اس سے لطف اندوز ہوسکیں یا فائدہ اُٹھا سکیں تو یہ آرٹ کی معراج ہے۔یہی وجہ ہے کہ مغرب میں مشہور روسی آرٹسٹ ٹالسٹائے کے نظریہ کے مطابق نقادوں کا ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ آرٹ کا کمال ہے کہ جاہل اور غریب سے غریب لوگ اس کی قدر و قیمت سے صحیح طور پر واقف اور لطف اندوز ہوسکیں۔اسی لیے سادگی آرٹ کا زیور سمجھا جاتا ہے۔پھر اگر آرٹ کا موضوع اور تخیل مبارک اور نصب العین بلند ہو تو آرٹ میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔شاعری بھی ایک آرٹ ہے اور اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں آرٹ کے اس بلند نظریہ سے جب ہم مسدس حالی کو جانچتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت صاف رواں اور سیدھی سادی ہے، گہرے اور معنی خیز مطالب اور عبرت انگیز و رقت خیز مضامین کو روز مرہ میں ادا کیا گیا ہے۔فن کی رعایات اور رسمی شاعری کی خصوصیات سے مطلق سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔اسی کے ساتھ موضوع میں بلندی اور اثر آفرینی ہے۔اس کا تعلق ایک قوم کی حیات و موت سے ہے اور اس کے اشعار درد و اثر اور سوز و گداز سے معمور ہیں۔

ڈاکٹر گریہم بیلی:

اُردو لٹریچر بزبان انگریزی کتاب میں مسدس کے بارے میں لکھتے ہیں۔اُردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل اور بیانیہ نظم ہے۔

اقتباس مسدس:

مسدس ایک بیانیہ طولانی نظم ہے جو (1374) اشعار پر مشتمل ہے۔حالی نے مسدس کے بندوں کو ایک دوسرے میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ ان کا علاحدہ کرنا نظم کے حسن اور متن کو

نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہم نے آج کے دور کے ذوق مطالعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں اہم بندوں کو اقتباسات کے طور پر اور موضوع کے اعتبار سے اِس لیے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر دریا شیریں پانی پورا سینچا نہ جا سکے تو کم از کم اپنے ساغر میں اتنا تو کھینچا جا سکے کہ کسی حد تک تشنگی کم ہو جائے اور پھر دریا سے سیراب ہونے کی امنگ بڑھ جائے۔

مسلمان کی حالت:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

دور جاہلیت:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا — ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا — جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

ولادت ختمی مرتبت ﷺ:

یکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا — دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

سیرت نبی ﷺ:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگذر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

پیغام اسلام:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا قول ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی — اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور چمک دور دور اس کی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

تعلیم وتربیت کلمہ گویان:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق — زبان اور دل کی شہادت کے لائق
مبرا ہے شرکت سے اُس کی خدائی — نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی
سکھائے مشیت کے آداب ان کو — پڑھائے تمدن کے سب باب ان کو
جتائی انہیں وقت کی قدر و قیمت — دلائی انہیں کام کی حرص و رغبت
غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے — فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
یہ کہہ کر کیا علم پر ان کو شیدا — کہ ہیں دور رحمت سے سب اہل دنیا
سکھائی انہیں نوع انساں پہ شفقت — کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر
کہ حکمت کو ایک گم شدہ لال سمجھو — جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

قرون اولیٰ کے مسلمان:

سب اسلام کے حکم بردار بندے — سب اسلامیوں کے مدد گار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے — یتیموں کے رانڈوں کے غم خوار بندے

رہ کفر و باطل سے بے زار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکام دیں پر جھکا دینے والے خدا کے لیے گھر لٹا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

صدر اسلام اور احوال دنیا:

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا اندھیرا تھا اک ربع مسکوں پہ چھایا
نہ ہنگامہ تھا گرم عبرانیوں کا نہ اقبال یاور تھا نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا
اِدھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا کہ تھا گیان گن کا لدایاں سے ڈیرا
اُدھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا کہ دل سب کے کیش و کنش سے تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا کہانیوں میں نہ یزداں پرستی تھی یزدانیوں میں

مسلمانوں کی ترقی:

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی
ہر اک ملک میں ان کی پھیلی امارت ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت
نہیں اس طبق پر کوئی براعظم نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب ، ہند ، مصر ، اندلس ، شام ، دیلم بناؤں سے ہے اُن کی معمور عالم
ہوا اندلس ان سے گل زار یک سر جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیت حمرہ کی گویا زباں پر

کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

سنے گوش عبرت سے گر جا کے انساں تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہر اسلام تاباں ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوران
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

علم وحکمت کا گہوارہ:

وہ لقمان و سقراط کے در مکنون پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہر سکوت ان کی ٹوٹی اسی باغ رعنا سے لو ان کی پھوٹی
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لا کر چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

علم فلکیات اور رصد گاہیں:

وہ سنجار کا اور کوفہ کا میداں فراہم ہوئے جس میں سیّاح دوراں
کرہ کی مساحت کے پھیلائے ساماں ہوئی جزو سے قدر کل کی نمایاں
زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے کہ عباسیوں کی سبھا وہ کدھر ہے
سمر قند سے اندلس تک سراسر انہیں کی رصد گاہیں نہیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر انہیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ بانی نشاں ہیں وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

آزادی وحریت:

آزادی میں جو آج فایق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

ادب اور طب کا فروغ:

عرب کی جو دیکھی وہ آتش زبانی — وہ خطبوں میں مانند دریا روانی
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے — تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
نوا سنجیاں ان سے سیکھی ہیں سب نے — زباں کھول دی سب کی نطق عرب نے
زمانہ میں پھیلی طب ان کی بدولت — ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
ابوبکر رازی ، علی ابن عیسا — حکیم گرامی حسین ابن سینا
حنین ابن اسحاق قسّیس دانا — ضیا ابن بیطار راس الاطبّا
انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا — انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا

اسلام کا زوال:

یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا — گیا چھوٹ سر رشتہ دین ہدا کا
رہا سر پہ باقی نہ سایا ہما کا — وہ پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک
رہا دین باقی نہ اسلام باقی — اک اسلام کا رہ گیا نام باقی
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر — ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے — کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے
کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر — وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر

مسلمانان ہندوستان:

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے — کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے — عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل
بہت آگ چلموں کی سلگانے والے بہت گھاس کی گٹھریاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے بہت فاقہ کر کر کے مر جانے والے
جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر تو نکلیں گے نسل ملوک ان میں اکثر
بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں روز
مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

ہمارے شاعر:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی سزا
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے!

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے کہیں مل کے ''خس کم جہاں پاک'' سارے

ہمارے علمائے دین:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدا کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبا خدا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے — وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے
رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوا — نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملاّ

یہ ہیں جادہ پیما اے راہِ طریقت — مقام ان کا ہے ماورائے شریعت
انہیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت — انہیں کے ہے قبضہ میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب — یہی ہیں جنید اور یہیں با یزید اب
بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی — جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی — مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ — یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

ہمیں یہاں یگانہ چنگیزی اور جمیل مظہری کے اشعار یاد آرہے ہیں۔ یگانہ کہتے ہیں: ؎

سر پھرا دے آدمی کا ایسا خبط مذہب کیا — سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا

جمیل مظہری نے کہا تھا ؎

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی ﷺ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت — نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت — مُقَلِّد کرے نا مُقَلِّد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم — کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریاں:

تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم — جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم
گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا — مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا
نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں — کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں

اگر نشہ مئے ہو غیبت میں پنہاں تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں
نشہ میں تکبر کے ہے چُور کوئی حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی
منھ اپنا ہو گو دین و دنیا میں کالا نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا

امیرزادوں کے کرتوت:

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دہت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی
اگر ماں ہے دکھیا تو ان کی بلا سے اپاہج ہے باوا تو ان کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو ان کی بلا سے جو مرتا ہے کنبہ تو ان کی بلا سے
جنہوں نے لگائی ہے لو دل رُبا سے
غرض پھر انہیں کیا رہی ماسوا سے
اگر شش جہت میں کوئی دل رُبا ہے تو دل ان کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اُس کی دن رات نامِ خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں
نمونے یہ اعیان و اشراف کے ہیں سلف ان کے وہ تھے خلف ان کے یہ ہیں
انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے انہیں کے پرستار پیرو جواں تھے
یہی مامن عاجز و ناتواں تھے یہی مرجع دیلم و اصفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی انہیں کے گھروں میں تھی صاحبقرانی

نسل جدید سے توقع:

وہ اسلام کی پود شاید یہی ہے کہ جس کی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آیندہ چشم یہی ہے بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے
یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں

یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری کہ بخشیں گی جو دین میں استواری
کریں گی یہی قوم کی غم گساری انہیں پر امیدیں ہیں موقوف ساری
یہی شمع اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی!!

شمع امید:

جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
بہت تُو نے پستوں کو بالا کیا ہے اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے
یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا
یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں سفال و خزف کے ہیں انبار گریاں
چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ
یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہے گا دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہے گا

ترقی کا عزم:

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا کہ مکروہ تھی بُو تو کڑوا مزا تھا
حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ زمانے کے غُل نے جگایا ہے کچھ کچھ
حوادث کے بن گذارا نہیں یاں بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں
بہت یکہ تازوں کو یاں گرتے دیکھا سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا
نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

حرکت میں برکت:

ہلانے سے ڈوری کے گر ڈور ہلتی تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

فداکاری:

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے نمایش کے بے زار دشمن ریا کے

کسی پر چلے تیر آماج یہ ہیں — لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں
مہم بن کیے سر نہیں بیٹھتے یہ — جب اٹھتے ہیں اٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو — انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی — انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے:

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی — جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی — فضیلت نہ عزت نہ فرمانروائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں — ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں
حکومت ملی اُن کو صفار تھے جو — امامت کو پہنچے وہ قصار تھے جو
وہ قطب زماں ٹھہرے عطار تھے جو — بنے مرجع خلق نَجّار تھے جو
ابوالفضل یاں اٹھے سراج کتنے — ابوالوقت ہو گذرے حلاج کتنے

علم بڑی نعمت ہے:

ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں سب یاں — کہ ہے علم سرمایہ فخر انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں — رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ — کھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ
جواہر تھا اک سب کی نظروں میں بھاری — پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری — نہ تھیں طاقتیں اُس کی معلوم ساری
پہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی — کہ ہے علم میں زور دست الٰہی
کیا کوہساروں کو مسمار اس نے — بنایا سمندر کو بازار اس نے
زمینوں کو منوایا دوار اس نے — ثوابت کو ٹھہرایا سیار اس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا — دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا

قدیم طلاب اور درس گاہیں:

عراقیں و شامات و خوارزم وتوراں — جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں

وہیں پے سپر کر کے کوہ و بیاباں پہنچتے تھے طلاب اُفتاں و خیزاں
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا ہر اک راہ میں ان کا تانتا بندھا تھا
نظامیہ نوریہ مستنصریہ نفیسیہ ستیّہ اور صاحبیہ
روحیہ غریہ اور قاہریہ عزیزیہ زینیہ اور ناصریہ
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے حجازی و کُردی و قپچاقیوں کے

مناجات:

الٰہی بحق رسول ﷺ تہامی ہر اک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی برابر تھے مکی و زنگی و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے بنایا بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا
طفیل اُس کا اور اُس کی عزت کا یا رب پکڑ ہاتھ جلد اُس کی اُمت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب غبار اُس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب
کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اس کی ہوا پست اسلام پستی سے اُس کی
بچا اُن کو اُس تنگنائے بلا سے کہ رستہ ہو گم رہرو و رہنما سے
نہ امید یاری ہو یار آشنا سے نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں دلوں میں امیدوں کی جا حسرتیں ہوں
انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کمیں گاہ بازی دوراں دکھا دے جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تا کہ باراں سے پہلے سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

☆.....☆.....☆

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا

رباعی

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا[1] دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدہی[2] ہر جزر[3] کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

---

[1] ابھرنا: پستی سے نکلنا۔ [2] مد: چڑھاؤ۔ ترقی [3] جزر: اتار۔ تنزل

مسدس

کسی نے یہ بقراط[1] سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک[2] ہیں کیا کیا
کہا ''دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان[3] سمجھیں
سبب یا علامت گر اُن کو سمجھائیں تو تشخیص[4] میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں یونہیں رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہرگز نہ مانوس ہوں وہ
یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ''
یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دُور اور طوفاں بپا ہے گماں[5] ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی
گھٹا سر پہ ادبار[6] کی چھا رہی ہے فلاکت[7] سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست[8] پس و پیش منڈلا رہی ہے چپ و راست[9] سے یہ صدا آ رہی ہے

---

[1] بقراط حکیم تھا جو شام کے شہر حمص میں رہتا تھا۔ یہ حکیم سکندر اعظم سے سو سال قبل گزرا ہے۔ عربی زبان میں سب سے پہلے اسی کی طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔

[2] مہلک: مار ڈالنے والا۔

[3] ہذیان: بے ہودہ اور بے کار باتیں۔

[4] تشخیص: بیماری کی شناخت۔

[5] گماں: امکان، خدشہ۔

[6] اِدبار: نحوست، مفلسی۔

[7] فلاکت: مفلسی، ناداری۔

[8] پس و پیش: آگے پیچھے۔

[9] چپ و راست: بائیں دائیں۔

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

پر اُس قوم غافل کی غفلت وہی ہے تنزل[1] پہ اپنے قناعت[2] وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت[3] وہی ہے ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

بہائم[4] کی اور اُن کی حالت ہے یکساں کہ جس حال میں ہیں اُسی میں ہیں شاداں[5]
نہ ذلت سے نفرت نہ عزت کا ارماں نہ دوزخ سے ترساں[6] نہ جنت کے خواہاں
لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے

وہ دیں جس نے اعدا[7] کو اخواں بنایا وحوش[8] اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غم خوارِ دَوراں بنایا گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا
وہ خطہ جو تھا ایک ڈھوروں[9] کا گلہ
گراں[10] کر دیا اُس کا عالم سے پلہ

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا جہاں سے الگ اک جزیرہ[11] نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا

---

[1] تنزل: پستی۔ [2] قناعت: اپنی حالت پر راضی رہنا۔
[3] رعونت: غرور۔ [4] بہائم: جانور۔
[5] شاداں: خوش، مسرور۔ [6] ترساں: خوف زدہ۔
[7] قرآن کی اُس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ تم دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور تم اُس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔
[8] وحوش: حیوانات۔ [9] ڈھوروں: مویشیوں۔
[10] گراں کر دیا: وزنی کر دیا۔ [11] جزیرہ: خشکی کا وہ خطہ جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہو۔

[1] تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور[2] کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے سامان تھے واں میسر کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آبِ باراں[3] پہ تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ[4] اور ہوا آتش افشاں[5] لوؤں کی لپٹ بادِ[6] صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں[7]
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اُس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا[8] میں ڈیرہ تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

کہیں آگ پجتی[9] تھی واں بے محابا[10] کہیں تھا کواکب پرستی[11] کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث[12] پر دل سے شیدا بتوں کا عمل سو بسو[13] جا بجا تھا

---

[1] تمدن: تہذیب۔
[2] روح پرور: روح کو ترقی دینے والی۔
[3] آبِ باراں: بارش کا پانی۔
[4] سنگلاخ: پتھریلی۔
[5] آتش افشاں: آگ بکھیرنے والی۔
[6] بادِ صرصر: آندھی کی تیز ہوا۔
[7] خارِ مغیلاں: ببول کے کانٹے۔
[8] ڈیرہ: خیمہ، سکونت، قیام۔
[9] آگ پجتی: آگ کا پوجنا۔
[10] بے محابا: بے خوف۔
[11] کواکب: تارے۔
[12] تثلیث: تین خداؤں کو ماننا، عیسائیت۔
[13] سو بسو: ہر طرف۔

کرشموں کا راہب[1] کے تھا صید[2] کوئی
طلسموں[3] میں کاہن[4] کے تھا قید کوئی

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا[5] خدا کا خلیل[6] ایک معمار تھا جس[7] بنا کا
ازل[8] میں مشیت نے تھا جس کو تاکا کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا[9]
وہ تیرتھ[10] تھا اک بُت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا

قبیلے قبیلے کا اک بت جدا تھا کسی کا ہبل[11] تھا کسی کا صفا[11] تھا
یہ عزا[11] پہ وہ نائلے[11] پر فدا تھا اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران[12] کی چوٹیوں پر

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ[13]
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے[14]

---

[1] راہب: عیسائی زاہد، تارک الدنیا۔
[2] صید: شکار۔
[3] طلسموں: جادوگری، ساحری
[4] کاہن: فال دیکھنے والا، جادوگر۔ زمانہ جاہلیت میں عرب میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ صائبین آگ اور ستاروں کی پوجا کرتے، عیسائی تثلیث کے قائل اور قریش بتوں کی پرستش کرتے تھے۔
[5] سب سے پہلا گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے جو بیت المقدس سے ایک ہزار سال قبل اور ولادت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل تعمیر ہو چکا تھا۔
[6] خلیل: سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔
[7] بنا: عمارت۔
[8] ازل: ابتدا۔
[9] چشمہ ہدیٰ: ہدایت کا چشمہ۔
[10] تیرتھ: ہندوں کی زیارت گاہیں۔
[11] ہبل، صفا، عزا اور نائلے بتوں کے نام ہیں۔
[12] فاران: مکہ کا پہاڑ۔
[13] تازیانہ: کوڑا۔
[14] بے باک: نڈر۔

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اَڑ بیٹھتے تھے سُلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گرواں شرارا [1]
تو اُس سے بھڑک اُٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر [2] اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی تھی اک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چَرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
[3] لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یُونہیں چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

[4] اسی طرح اک اور خوں ریز بیدا عرب میں لقب حرب واحس [4] ہے جس کا
رہا ایک مدت تک آپس میں برپا بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں میند کی تھی کسی نے

---

[1] شرارا: شعلہ۔

[2] بنی بکر اور بنی تغلب دو قبیلوں کی لڑائی بہت مدت تک ہوتی رہی جس میں ستر (70) ہزار افراد مارے گئے۔ ان دونوں قبیلوں کی جنگ کی وجہ صرف ایک معمولی سا واقعہ تھا جہاں ایک عورت نے اونٹ کو کھیت میں مارا، اونٹ کے مالک نے اُس عورت کی چھاتی زخمی کر دی۔

[3] لبِ جُو: نہر کا کنارہ۔

[4] یہ بند بعض مسدس کے نسخوں میں نہیں۔ اصمعی جو دور جاہلیت کے قصوں کا راوی ہے لکھتا ہے واحس ایک تیز رفتار گھوڑا تھا جو گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی شخص نے اُسے ڈرا دیا اس پر 568 عیسوی سے اسلام کے نزول تک لڑائیاں ہوتی رہیں اور قبیلے کے قبیلے کٹ مر گئے۔

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دُختر تو خوف شماتت[1] سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور[2] کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جو اُن کی دن رات کی دل لگی تھی شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
[3]تعیش تھا ، غفلت تھی ، دیوانگی تھی غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی
بہت اس طرح اُن کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت بڑھا جانب بو قبیس[4] ابر رحمت
ادا خاک بطحا[5] نے کی وہ ودیعت چلے آئے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ[6] سے ہویدا
دعائے خلیل[7] اور نوید مسیحا[8]

ہوئے محو[9] عالم سے آثارِ ظلمت کہ طالع[10] ہوا ماہِ بُرجِ سعادت[11]
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدّت کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت

---

[1] شماتت: بےعزتی، ذلت۔
[2] تیور: اخلاق
[3] تعیش: عیش پسندی۔
[4] بوقبیس: پہاڑ جس کے نیچے مکہ آباد ہے۔
[5] مکہ کی سنگلاخ زمین۔
[6] آمنہ بنت وہب حضور ﷺ کی ماں تھیں۔
[7] خلیل: سیّدنا ابراہیم علیہ السلام۔
[8] نوید مسیحا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری۔ یہاں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے دادا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل یوحنا کے سولہویں باب میں اپنی امت کو بشارت دی تھی کہ میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام فارقلیط (یعنی احمد) ہوگا۔
[9] محو: غائب ہونا۔
[10] طالع: طلوع ہونا۔
[11] بُرجِ سعادت: مقام عزت۔

[1]پہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا [2] سے

وہ نبیوں میں رحمت [3] لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا [4] ضعیفوں کا ماویٰ [5]
یتیموں کا والی [6] غلاموں کا مولیٰ [7]

خطا کار سے درگزر کرنے والا بد [8] اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد [9] کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و [10] شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا [11] ساتھ لایا

مسِ [12] خام کو جس نے کُندن [13] بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں [14] سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اُس کے جوہر تھے اصلی ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی

---

[1] چالیسویں سال: یہاں بعثت مراد ہے جو چالیسویں سال ہوئی۔
[2] مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے جس کے غارِ حرا میں حضور ﷺ ذکر و فکر کرتے تھے اور سب سے پہلے وحی وہیں نازل ہوئی۔
[3] یہاں آیت قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے آپ (ﷺ) تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔
[4] ملجا: پناہ گاہ۔
[5] ماویٰ: ٹھکانہ۔
[6] والی: سرپرست۔
[7] مولیٰ: آقا۔
[8] بداندیش: برا سوچنے والا۔
[9] مفاسد: فسادات۔
[10] شیر و شکر: محبت اور اتحاد۔
[11] نسخہ کیمیا: قرآن مجید کا استعارہ ہے۔
[12] مسِ خام: کچا تانبا۔
[13] کندن: خالص سونا۔
[14] قرنوں: صدیوں۔

یہ تھا ثبت [1] علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا [2] اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسب فرمان [3] داور سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر [4]
یہ فرمایا سب سے کہ ''اے آل غالب [5]
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب''؟ [6]
کہا سب نے ''قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا''
کہا ''گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟
کہ فوجِ گراں [7] پشت کوہِ صفا [8] پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات [9] پا کر''
کہا ''تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے''
کہا ''گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا''

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی [10] عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل [11] نامِ حق سے

---

[1] ثبت علم قضاوقدر: تقدیرالٰہی میں لکھا جاچکا ہے۔ [2] طلا: سونا۔
[3] حسب فرمان: حکم کے مطابق۔ [4] کوہ صفا: مکہ کی پہاڑی۔
[5] آل غالب: غالب رسول اللہ ﷺ کے دادا کا نام ہے جو عدنان سے گیارہ پشت نیچے ہیں۔
[6] کاذب: جھوٹا۔ [7] فوج گراں: بڑی طاقت ور فوج۔
[8] پشتِ کوہِ صفا: کوہ صفا کے پیچھے۔ [9] گھات پانا: موقع پانا۔
[10] صوتِ ہادی: رہنما کی آواز۔ [11] دشت و جبل: دشت اور پہاڑ۔

سبق پھر شریعت کا اُن کو پڑھایا حقیقت کا گُر اُن کو ایک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا
کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اُٹھا کر

کسی کو ازل[1] کا نہ تھا یاد پیماں[2] بھلائے تھے بندوں نے مالک کے فرماں
زمانے میں تھا دور صہبائے بطلاں[3] مئے حق[4] سے محرم[5] نہ تھی بزمِ دوراں
اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک
خُم معرفت[6] کا تھا منھ خام[7] اب تک

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا[8] سے نہ آگاہ تھے مبدا و منتہا[9] سے
لگائی تھی ایک اک نے لو ماسوا[10] سے پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے
یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی[11] نے للکار کر جب پکارا

کہ ''ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لَو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ

اُسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم اُسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اُسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اُسی کی طلب میں مرو جب مرو تم

---

[1] ازل: ابتدا۔
[2] پیماں: وعدہ۔
[3] صہبائے بطلان: باطل کی شراب۔
[4] مئے حق: حق کی شراب۔
[5] محرم: واقف وآگاہ۔
[6] خُمِ معرفت: معرفت کی صراحی۔
[7] منھ خام: منہ بند تھا۔
[8] قضا اور جزا: تقدیر اور ثواب۔
[9] مبدا و منتہا: ابتدا اور انتہا۔
[10] ماسوا: اللہ کے علاوہ۔
[11] راعی: چرواہا۔

مُبَرّا [1] ہے شرکت سے اُس کی خدائی
نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی

خرد [2] اور ادراک [3] رنجور [4] ہیں واں مہ و مہر [5] ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاندار [6] مغلوب و مقہور [7] ہیں واں نبی اور صدیق [8] مجبور ہیں واں
نہ پرستش ہے رہبان و احبار [9] کی واں
نہ پروا ہے ابرار و احرار [10] کی واں

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ [11]
اسی طرح ہوں میں بھی ایک اُس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خَم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی [12]

اسی طرح دل اُن کا ایک اک سے توڑا ہر اک قبلہ کج [13] سے منھ اُن کا موڑا
کہیں ماسوای کا علاقہ نہ چھوڑا خداوند سے رشتہ بندوں کا جوڑا

---

[1] مُبَرّا: پاک، بری۔ [2] خرد: عقل۔
[3] ادراک: محسوسات۔ [4] رنجور: رنجیدہ۔
[5] مہ و مہر: چاند سورج۔ [6] جہاندار: حکمران۔
[7] مغلوب و مقہور: شکست خوردہ اور زیر طاقت ہیں۔ [8] صدیق: دوست۔
[9] رہبان و احبار: عیسائیوں کے درویش اور یہودیوں کے علما۔
[10] ابرار و احرار: نیک بندے اور آزاد بندے۔
[11] سرفگندہ: سر جھکائے ہوئے۔
[12] ایلچی: سفیر۔
[13] قبلہ کج: ٹیڑھے قبلے سے۔

کبھی کے جو پھرتے تھے مالک سے بھاگے
دیے سر جُھکا اُن کے مالک کے آگے

پتا اصل مقصود [1] کا پا گیا جب نشاں گنج دولت [2] کا ہاتھ آ گیا جب
محبت سے دل اُن کو گرما گیا جب سماں اُن پہ توحید کا چھا گیا جب
سکھائے معیشت [3] کے آداب اُن کو
پڑھائے تمدن کے سب باب [4] اُن کو

جتائی انہیں وقت کی قدر و قیمت دلائی انہیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب آخر رفاقت ہو فرزند وزن اس میں یا مال و دولت
نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمہارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

غنیمت ہے صحت علالت [5] سے پہلے فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے اقامت مسافر کی رحلت [6] سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

یہ کہہ کر کیا علم پر اُن کو شیدا [7] کہ ''ہیں دُور رحمت سے سب اہلِ دنیا
مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا ہے تعلیم کا یا سدا جن میں چرچا
انہیں کے لیے یاں ہے نعمت خدا کی
انہیں پر ہے واں جا کے رحمت خدا کی''

---

[1] اصل مقصود: اصلی مقصد۔ [2] گنج دولت: دولت کا خزانہ۔
[3] معیشت: معاشرت۔ [4] باب: درس۔
[5] علالت: بیماری۔ [6] رحلت: موت۔
یہاں حالی نے تیسرے بند میں حضور ﷺ کی حدیث کو نظم کیا ہے۔
[7] شیدا: عاشق۔

سکھائی انہیں نوع[1] انساں پہ شفقت کہا ''ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسائے سے رکھتے ہیں وہ محبّت شب و روز پہنچاتے ہیں اُس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں
خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر''
ڈرایا تعصّب سے اُن کو یہ کہہ کر کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر وہ ''ساتھی ہمارا نہ ہم اُس کے یاور
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ[2]
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا
بچایا برائی سے اُن کو یہ کہہ کر کہ ''طاعت سے ترک معاصی[3] ہے بہتر
تورّع[4] کا ہے ذات میں جن کی جوہر نہ ہوں گے کبھی عابد اُن کے برابر
کرو ذکر اہل ورع[5] کا جہاں تم
نہ لو عابدوں کا کبھی نام واں تم''
غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی کہ ''بازو سے اپنی کرو تم کمائی
خبر تاکہ لو اُس سے اپنی پرائی نہ کرنی پڑے تم کو دَر دَر گدائی
طلب سے ہے دنیا کی گریاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت''

---

[1] نوع انساں: انسان جماعت۔ [2] بہرہ: فایدہ۔
[3] ترک معاصی: گناہوں سے دوری۔ [4] تورع: پرہیزگاری۔
[5] اہل ورع: پرہیزگار۔

امیروں کو تنبیہ کی اس طرح پر کہ ''ہیں تم میں جو اغنیا[1] اور توانگر
اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر بنی نوع کے ہوں مددگار و یاور
نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اُٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک کام ہرگز
تو مُردوں سے آسودہ تر ہے وہ طبقہ زمانہ مبارک ملے جس کو ایسا
پہ جب اہل دولت[2] ہوں اشرار دنیا نہ ہو عیش میں جن کو اوروں کی پروا
نہیں اُس زمانے میں کچھ خیر و برکت
اقامت سے بہتر ہے اُس وقت رحلت''
دیے پھیر دل اُن کے مکر و ریا سے بھرا اُن کے سینے کو صدق[3] صفا سے
بچایا انہیں کذب[4] سے افترا[5] سے کیا سرخ رو خلق سے اور خدا سے
رہا قول حق میں نہ کچھ باک[6] اُن کو
بس اک شوب[7] میں کر دیا پاک اُن کو
کہیں حفظِ[8] صحت کے آئیں سکھائے سفر کے کہیں شوق اُن کو دلائے
مفاد ان کو سوداگری کے سُجھائے اُصول اُن کو فرماندہی[9] کے بتائے
نشاں راہ و منزل کا ایک اک دکھایا
بنی نوع کا اُن کو رہبر بنایا
ہوئی ایسی عادت پہ تعلیم غالب کہ باطل کے شیدا ہوئے حق کے طالب
مناقب سے[10] بدلے گئے سب مثالب[11] ہوئے روح سے بہرہ ور اُن کے قالب[12]

---

[1] اغنیا: ثروت مند، امیر۔
[2] اشرار: بدمعاشی، شریر۔
[3] صدق وصفا: سچے اور پاکیزہ۔
[4] کذب: جھوٹ۔
[5] افترا: بہتان۔
[6] باک: خوف، شک۔
[7] شوب: دھلائی۔
[8] حفظ صحت: صحت کی حفاظت۔
[9] فرماندہی: حکومت کرنا۔
[10] مناقب: تعریفیں۔
[11] مثالب: عیب۔
[12] قالب: بدن۔

جسے راج رد کر چکے تھے وہ پتھر
ہوا جا کے آخر کو قائم سرے پر

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجت نبی نے کیا خلق سے قصدِ رحلت
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے یتیموں کے رانڈوں کے غم خوار بندے
رہِ کفر و باطل سے بے زار سارے
نشے میں مئے حق [1] کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے کہانت [2] کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے خدا کے لیے گھر لٹا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اگر اختلاف اُن میں باہم دگر تھا تو بالکل مدار [3] اُس کا اخلاص [4] پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا خلاف آشتی سے خوش آیندہ [5] تر تھا
یہ تھی موج پہلی اُس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغ گیتی [6]

---

[1] مئے حق: حق کی شراب۔
[2] کہانت: جن اور شیاطین کے ذریعہ سے لوگوں کو غیب کی خبریں دینی یا جانوروں کی آواز سے شگون لینا۔ جاہلیت میں اور ابتدائے اسلام میں کاہن لوگ عرب میں بہت تھے مگر اسلام نے ان کو کالعدم کر دیا۔
[3] مدار: محور۔
[4] اخلاص: خلوص۔
[5] خوش آیندتر: خوش تر۔
[6] باغ گیتی: دنیا کا باغ۔

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت[1] نہ پوشش[2] سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے اُمت کے ایسے نگہباں ہو گلے کا جیسے نگہبان چوپاں[3]
سمجھتے تھے[3] ذمی و مسلم کو یکساں نہ تھا عبد و حر[3] میں تفاوت نمایاں
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماجائی[4] بہنیں ہو جیسی

رہ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ[5] اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ اُن کی شریعت کے قبضے میں تھی باگ اُن کی
جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کفایت جہاں چاہیے واں کفایت سخاوت جہاں چاہیے واں سخاوت
جچی اور تلی دشمنی اور محبت نہ بے وجہ الفت نہ بے وجہ نفرت
جھکا حق سے جو جُھک گئے اُس سے وہ بھی
رکا حق سے جو رُک گئے اس سے وہ بھی

ترقی کا جس دم خیال اُن کو آیا اک اندھیر تھا رُبع[6] مسکوں میں چھایا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایہ بلندی سے تھا جس نے سب کو گرایا

---

[1] کلفت: زحمت۔
[2] پوشش: کپڑے۔
[3] چوپان: چرواہا۔
[4] ماجائی: سگی ماں کی طرح۔
[5] لاگ: محبت۔
[6] ربع مسکوں: ایک چوتھائی خشکی کا حصہ جس پر لوگ بستے ہیں، مراد دنیا۔

وہ نیشن[1] جو ہیں آج گردوں[2] کے تارے
دھندلکے میں پستی کے پنہاں تھے سارے

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں[3] کا نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں[4] کا
پرا گندہ[5] دفتر تھا یونانیوں کا پریشاں تھا شیرازہ[6] ساسانیوں[7] کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا

ادھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا کہ تھا گیان[8] گن کا لدا یاں سے ڈیرا
ادھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا کہ دل سب نے کیش وکنش سے[9] تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا گیانیوں[10] میں
نہ یزداں[11] پرستی تھی یزدانیوں[12] میں

ہوا ہر طرف موج زن تھی بلا کی گلوں پر چھری چل رہی تھی جفا کی
عقوبت[13] کی حد تھی نہ پرسش خطا کی پڑی لٹ رہی تھی ودیعت[14] خدا کی
زمیں پر تھا ابرِ ستم کا ڈڑیڑا[15]
تباہی میں تھا نوع انساں کا بیڑا

وہ قومیں جو ہیں آج غم خوار انساں درندوں کی اور اُن کی طینت[16] تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں بہت دور پہنچا تھا واں ظلم و طغیاں

---

[1] نیشن: قوم
[2] گردوں: فلک، آسمان۔
[3] عبرانیوں: یہودیوں۔
[4] نصرانیوں: عیسائیوں۔
[5] پراگندہ: منتشر
[6] شیرازہ: کتاب کی پشت کا کپڑا۔
[7] ساسانیوں۔ ساسان پسرِ دارا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ہیں وہ ساسانی کہلاتے ہیں۔
[8] گیان گن: علم وہنر۔
[9] کیش وکنش: مذہب وکردار۔
[10] گیانیوں: عالموں۔
[11] یزداں: خدا۔
[12] یزدانیوں: مجوسیوں۔
[13] عقوبت: عذاب، سزا۔
[14] ودیعت: امانت۔
[15] ڈڑیڑا: بارش۔
[16] طینت: فطرت۔

بنے آج جو گلہ باں [1] ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیے ، آدمی خور [2] سارے

ہنر کا جہاں گرم بازار ہے اب جہاں عقل و دانش کا بہوار [3] ہے اب
جہاں ابر رحمت گہر بار [4] ہے اب جہاں ہن [5] برستا لگاتار ہے اب

تمدن کا پیدا نہ تھا واں نشاں تک
سمندر کی آئی نہ تھی موج واں تک

نہ رستہ ترقی کا کوئی کھلا تھا نہ زینہ بلندی پہ کوئی لگا تھا
وہ صحرا انہیں قطع کرنا پڑا تھا جہاں نقشِ پا تھا نہ شورِ درا [6] تھا

جو ہیں کان میں حق کی آواز آئی
لگا کرنے خود اُن کا دل رہنمائی

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اُس کی پہنچی جو ٹیگس [7] پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

کیا اُمیّوں [8] نے جہاں میں اُجالا ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بتوں کو عرب اور عجم سے نکالا ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا

---

[1] گلہ باں: رہنما، چرواہا۔
[2] آدمی خور: آدمی کو کھانے والا۔
[3] بہوار: لین دین، بیوپار۔
[4] گہر بار: جواہر نچھاور کرنے والا۔
[5] ہن: سونے کا سکہ۔
[6] شورِ درا: گھنٹی کی آواز جو قافلہ کے جانوروں کے گردن میں ڈالتے ہیں۔
[7] ٹیگس: اسپین کا دریا۔
[8] اُمیّوں: مکہ کے رہنے والے (ام القریٰ یعنی مکہ)۔

زمانے میں پھیلائی توحید مطلق
لگی آنے گھر گھر سے آواز حق حق

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں بڑی کھل بلی کفر کی سرحدوں میں
ہوئی آتش افسردہ آتشکدوں میں لگی خاک سی اُڑنی سب معبدوں میں
ہوا کعبہ آباد سب گھر اُجڑ کر
جمے ایک جا سارے دنگل بچھڑ [1] کر

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں [2] نے کیا کسبِ اخلاق رُوحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں [3] نے کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں [4] نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریخ چھوڑا

ارسطو [5] کے مردہ فنوں کو جلایا فلاطون [6] کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر اک شہر قریے [7] کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ [8] گراں سے

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیغمبر ﷺ
کہ ''حکمت کو اک گُم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو''

---

[1] دنگل: لڑنے کی جگہ۔ [2] نصرانیوں: عیسائیوں۔
[3] صفاہانیوں: اصفہان ایران کے لوگ۔ [4] یزدانیوں: مجوسیوں۔ (آگ پوجنے والے)
[5] ارسطو یونان کا فلاسفر اور حکیم تھا۔ وہ افلاطون کا شاگرد جو 362 سال قبل از مسیح 63 سال کی عمر میں مرا۔ وہ سکندر کا استاد بھی رہا ہے۔
[6] افلاطون یونانی تھا اور سقراط کا شاگرد تھا۔ اس نے اکیاسی برس عمر پائی۔
[7] قریہ: گاؤں۔ [8] خوابِ گراں: گہری نیند۔

ہر اک علم کے فن کے جویا[1] ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت[2] میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ سباحت میں مشہور دنیا ہوئے وہ
ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں مہیا کیے سب کے راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انہیں کر دیا رشکِ صحنِ گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں[3] مُصفّا دو طرفہ برابر درختوں کا سایہ
نشاں جا بجا میل و فرسخ کے برپا سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں[4] مہیا
انہیں کے ہیں سب نے یہ چربے[5] اُتارے
اُسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے

سدا اُن کو مرغوب سیر و سفر تھا ہر اک براعظم میں اُن کا گزر تھا
تمام اُن کا چھانا ہوا بحر و بر تھا جو لنکا میں ڈیرا تو بربر[6] میں گھر تھا
وہ گنتے تھے یکساں وطن اور سفر کو
گھر اپنا سمجھتے تھے ہر دشت و در[7] کو

---

[1] جویا ہونا: تلاش کرنا۔ [2] فلاحت: کھیتی باڑی۔
دوسرے بند کے آخری شعر میں حالی نے حضور ﷺ کی حدیث نظم کی ہے۔ (حکمت مسلمان کی گم شدہ شے ہے پس جہاں کہیں اس کو پائے تو وہی اس کا مستحق ہے)
[3] مصفا: صاف ستھرا۔ [4] سرائیں۔ مسافر خانے۔
[5] چربے: نقلیں، نقشے۔ [6] بربر: صحرا افریقہ کا شمالی شہر۔
[7] دشت و در: صحرا اور وادی۔
شیر شاہ سوری کے دور حکومت میں جو عمدہ سڑک بنوائی گئی تھی حالی اس کا خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ جہاں ہر سات میل پر مسافر خانہ، سڑک کے دو جانب بلند سایہ دار درخت، مسجدیں، غسل خانے اور باغات بنائے گئے تھے۔

جہاں کو ہے یاد اُن کی رفتار اب تک کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
ملایا[1] میں ہیں اُن کے آثار اب تک انہیں رو رہا ہے ملیبار[2] اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر[3]
نشان ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر[4]

نہیں اس طبق[5] پر کوئی بر اعظم نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب ، ہند ، مصر ، اندلس ، شام ، دیلم[6] بناؤں[7] سے ہیں اُن کی معمور[8] عالم
سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضا[9]
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے اُن کا

وہ سنگیں محل اور وہ اُن کی صفائی جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
وہ مرقد کہ گنبد تھے جن کے طلائی وہ معبد جہاں جلوہ گر تھی خدائی
زمانے نے گو ان کی برکت اُٹھالی
نہیں کوئی ویرانہ پر اُن سے خالی

ہوا اندلس[10] اُن سے گلزار یکسر جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر ہی ہے بیت حمرا[11] کی گو بازیاں پر

---

[1] ملایا: جزیرہ نما ہندوچین کا جنوبی حصہ۔
[2] ملیبار: ہندوستان کا جنوب مغربی ساحل (مالابار)
[3] ازبر: زبانی یاد رہنا۔
[4] جبرالٹر: یہ جبل الطارق ہے جسے عبدالرحمان کے غلام طارق نے اندلس کی مہم پر فتح کیا تھا۔
[5] طبق: زمین کا کرہ۔
[6] دیلم: ایران شمالی کا پہاڑی حصہ۔
[7] بناؤں: عمارتوں۔
[8] معمور: بھرپور۔
[9] کوہ بیضا: اندلس کا پہاڑ جس کی چوٹی برف سے سفید رہتی ہے۔
[10] اندلس: اسپین جہاں سات سو برس عیسائی قوم مسلمانوں کے تحت رہی۔
[11] بیت حمرا: اندلس کا خوبصورت شاہی محل آج بھی محفوظ ہے۔

کہ تھے آل عدنان [1] سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمین پر نشانی

ہویدا [2] ہے غرناطہ [3] سے شوکت اُن کی عیاں ہے بلنسیہ [4] سے قدرت اُن کی
بطلیوس [5] کو یاد ہے عظمت اُن کی ٹپکتی ہے قادس [6] میں سرحسرت اُن کی
نصیب اُن کا اشبیلیہ [7] میں ہے سوتا
شب و روز ہے قرطبہ [8] اُن کو روتا

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ [9] جہاں تھا تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں [10] کا نشاں تھا عراق عرب جس سے رشکِ جناں [11] تھا

---

[1] آل عدنان: خلفائے اندلس بنی امیہ سے تھے جو آل عدنان تھے۔
[2] ہویدا: ظاہر۔
[3] غرناطہ: گراناڈا اسپین کا علاقہ جس کو عرب غرناطہ کہتے ہیں۔
[4] بلنسیہ: اندلس کے مشرق میں خوبصورت شہر ہے جو باغوں اور نہروں سے بھرا ہے۔
[5] بطلیوس: قرطبہ اندلس کے شمال مغرب کا شہر جس میں شاہوں نے عالی شان عمارتیں بنوائیں۔
[6] قادس: انگریزی میں اس کو کیڈس کہتے ہیں یہ ایک چھوٹا خوبصورت جزیرہ ہے۔
[7] اشبیلیہ: اندلس کا پائے تخت تھا۔
[8] قرطبہ: اس کو کورڈوبا کہتے ہیں یہاں دنیا کی قدیم اور عظیم ترین مسجد ہے جسے گرجا بنا دیا گیا ہے لیکن ابھی ایک آدھ، محراب باقی ہے۔ علامہ نے قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے اور ایک شاہکار نظم قرطبہ لکھی۔
[9] بلادِ جہاں: دنیا کے شہر۔
[10] عباسیوں: بنی عباس (مسلمان خلیفے)
[11] جناں: جنت

اُڑا لے گئی باد پندار [1] جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار [2] جس کو

سنے گوشِ عبرت سے گرجا کے انساں تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہر [3] اسلام تاباں [4] ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوراں
پڑی خاکِ ایتھنز [5] میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

وہ لقمان [6] و سقراط کے درمکنوں [7] وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن [8] کے قانوں پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا [9] سے بو اُن کی پھوٹی

یہ تھا علم پرواں توجہ کا عالم کہ ہو جیسے مجروح [10] جویائے مرہم [11]
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم
[12] حریمِ خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

---

[1] پندار: غرور۔
[2] سیلِ تاتار: تاتاریوں کے لشکر۔
[3] مہر: سورج
[4] تاباں: چمکتا ہوا
[5] ایتھنز: یونان کا شہر۔
[6] لقمان: یونان کا حکیم جو چھے سو سال از مسیح زندگی بسر کرتا تھا اسے لامذہبی کے جرم میں پہاڑ سے نیچے گرا کر قتل کیا گیا۔ اس کی کہانیاں جو عرب میں امثال لقمان کے نام سے مشہور ہیں جس کے بارے میں یورپ کے مورخ لکھتے ہیں کہ انہی کہانیوں نے یورپ وحشی کو مہذب بنایا۔
[7] درمکنون: یکتا موتی۔ [8] سولن: ایتھنز یونان کا رہنے والا تھا جو قانون داں تھا۔
[9] رعنا: زیبا۔ [10] مجروح: زخمی
[11] جویائے مرہم: مرہم کے طلب گار۔ [12] حریمِ خلافت: سلطنت خلافت۔

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن[1] پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غروب روشن
نوشتوں[2] سے ہیں جن کے اب تک مزین کتب خانہ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

وہ سنجار[3] کا اور کوفے کا میداں فراہم ہوئے جس میں مَسّاحِ[4] دوراں
کُرے کی مساحت کے پھیلائے ساماں ہوئی جزو سے قدر کُل کی نمایاں
زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے
کہ عباسیوں کی سبھا[5] وہ کدھر ہے

سمر قند[6] سے اندلس تک سرا سر انہیں کی رصد گاہیں[7] تھیں جلوہ گستر[8]
سواد مراغہ[9] میں اور قاسیوں[10] پر زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مورخ ہیں جو آج تحقیق والے تفحّص[11] کے ہیں جن کے آئیں نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے
عرب ہی نے دل اُن کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترارے[12]

---

[1] لمعہ افگن: شعلے بکھیرنے والے۔ [2] نوشتوں: مکتوب، کتابیں۔
[3] سنجار: مابین دجلہ اور فرات ایک قدیم شہر۔ [4] مَسّاحِ: فاصلے ناپنے والے انجینئر۔
[5] سبھا: محفل [6] سمرقند: ترکمانستان کا ایک تاریخی شہر۔
[7] رصد گاہیں: لیبارٹریز جو علوم نجوم اور افلاک شناسی میں مدد دیتی ہیں۔
[8] جلوہ گستر: نمایاں۔
[9] مراغہ: آذربائیجان ایران کے پہاڑ پر ہلاکو خان کے حکم سے نصیر الدین طوسی کی سرپرستی میں رصد گاہ بنوائیں گئی۔
[10] دمشق کے شمال میں پہاڑ پر مامون رشید نے رصد گاہ بنوائی تھی جسے قاسیوں کے پہاڑ پر تکمیل کیا گیا۔
[11] تفحّص: جستجو کرنا۔ [12] ترارے: جست، چستی۔

اندھیرا تواریخ پر چھا رہا تھا ستارہ روایت کا گہنا [1] رہا تھا
درایت [2] کے سورج پہ ابر آ رہا تھا شہادت کا میدان دُھندلا رہا تھا
سرِ رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلے کا نشاں جس سے پایا
گروہ ایک جویا [3] تھا علم نبی کا لگایا پتہ جس نے ہر مفتری [4] کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ [5] کذب خفی [6] کا کیا قافیہ [7] تنگ ہر مدعی [8] کا
کیے جرح و تعدیل [9] کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں [10]
اسی دُھن میں آساں کیا ہر سفر کو اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازنِ علمِ دیں [11] جس بشر کو لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر [12] کو
پھر آپ اُس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزہ اُس کا چکھ کر
کیا فاش [13] راوی میں جو عیب پایا مناقب [14] کو چھانا مثالب [15] کو تایا
مشائخ میں جو قبح [16] نکلا جتایا ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسمِ ورع [17] ہر مقدس کا توڑا
نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

---

[1] گہنا: گہن لگنا، تاریک ہونا۔
[2] درایت: دانائی۔
[3] جویا: جستجو کرنے والا۔
[4] مفتری: حدیثیں گھڑنے والا۔
[5] رخنہ: شگاف۔
[6] کذب خفی: چھپا ہوا جھوٹ۔
[7] قافیہ تنگ کرنا: بحث ومباحثہ کرنا۔
[8] مُدعّی: دعویٰ کرنے والا۔
[9] جرح وتعدیل: بحث اور دلیل۔
[10] افسوں: فسانہ گری۔
[11] خازن علم دیں: علم دین کا خزانچی۔
[12] خبر اور اثر: حدیث کی قسمیں۔
[13] فاش: اعلان۔
[14] مناقب: خوبیاں۔
[15] مثالیب: عیوب۔
[16] قبح: عیب۔
[17] طلسم ورع: تقویٰ کا ڈھونگ۔

رجال[1] اور اسانید[2] کے جو ہیں دفتر گواہ اُن کی آزادگی کے ہیں یکسر[3]
نہ تھا اُن کا احساں یہ اک اہلِ دیں پر وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر
[4] لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل [5] بنے ہیں وہ کب سے

فصاحت کے دفتر تھے سب گاؤ خوردہ[6] بلاغت کے رستے تھے سب نا سپردہ[7]
اُدھر روم کی شمع انشا [8] تھی مردہ اِدھر آتش پارسی [9] تھی فسردہ
یکا یک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

عرب کی جو دیکھی وہ آتش زبانی سنی بر محل اُن کی شیوا بیانی [10]
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی [11] وہ خطبوں کی مانند دریا روانی
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے
تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے

سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم [12] کا نہ ڈھب یاد تھا شرح شادی و غم کا
نہ اندازِ تلقین [13] وعظ و حکم کا خزانہ تھا مدفون زباں اور قلم کا
نوا سنجیاں [14] اُن سے سیکھیں یہ سب نے
زباں کھول دی سب کی نُطقِ عرب [15] نے

---

[1] رجال: سے مراد علم رجال ہے جس میں عالموں اور حدیث کے راویوں کا مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔
[2] اسانید: علم حدیث ہے۔
[3] یکسر: ناگہاں۔
[4] لبرٹی: آزادی۔
[5] لبرل: آزاد۔
[6] گاؤخوردہ: نابود، ختم شدہ۔
[7] ناسپردہ: نادریافت۔
[8] انشا: بیان تحریر۔
[9] آتش پارسی: فارسی شاعری
[10] شیوابیانی: حسن گفتار۔
[11] ریشہ دوانی: دل میں جڑیں کرنے والی۔
[12] مدح وذم: تعریف اور مذمت۔
[13] تلقین: تعلیم، نصیحت۔
[14] نواسنجیاں: آواز کو پرکھنے اور تولنے کا عمل۔
[15] نطق: گفتگو، لہجہ۔

زمانے میں پھیلی طب ان کی بدولت ہوئی بہرہ ور[1] جس سے ہر قوم و ملت
نہ صرف ایک مشرق میں تھی اُن کی شہرت مسلم تھی مغرب تک ان کی حذاقت[2]
[3] سلر نو میں جو ایک نامی مطب تھا
وہ مغرب میں عطار مشک عرب تھا
ابوبکر رازی [4] علی ابن عیسیٰ [5] حکیم گرامی حسین ابن سینا [6]
حنین [7] ابن اسحاق قسیس دانا ضیا ابن بیطار [8] راس الاطبا
انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا
انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا [9]
غرض فن ہیں جو مایہ [10] دین و دولت طبیعی ، الٰہی ، ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ اور ہیئت سیاست ، تجارت ، عمارت ، فلاحت [11]
لگاؤ گے کھوج اُن کا جا کر جہاں تم
نشاں اُن کے قدموں کے پاؤ گے واں تم
ہوا گو کہ پامال بستاں [12] عرب کا مگر اک جہاں ہے غزل خواں عرب کا
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا سپید و سیہ پر ہے احساں عرب کا

---

[1] بہرہ ور: فائدہ مند۔ [2] حذاقت: مہارت۔
[3] سلر نو: اٹلی کے شہر میں مسلمانوں کا ایک مشہور طبی مدرسہ تھا جہاں تمام یورپ سے لوگ طب سیکھنے کے لیے آتے تھے۔
[4] ابوبکر رازی طبیب پہلے شہر رے پھر بغداد میں علاج کیا۔ تصنیفات 213 ہیں۔ 320 ہجری میں انتقال کیا۔
[5] علی ابن عیسیٰ بہت بڑے حکیم تھے۔
[6] بوعلی سینا کا قانوں صدہا سال مدرسوں میں پڑھایا گیا۔ 58 برس کی عمر میں انتقال ہوا اور ہمدان میں مدفون ہیں۔ کئی جلدوں میں قانوں 'شفا'، کتاب الانصاف اور لسان العرب کئی جلدوں میں ہے۔
[7] عباسیہ دور کا مشہور عیسائی طبیب حنین ابن اسحاق تھا۔
[8] ضیا نباتات کا عظیم عالم تھا۔ 646 ہجری میں وفات پائی۔
[9] کھیوا: ناؤ۔ [10] مایہ: ثروت۔
[11] فلاحت: درخت لگانے کا علم۔ [12] بستاں: چمن۔

وہ قومیں جو ہیں آج سرتاج سب کی
کنونڈی [1] رہیں گی ہمیشہ عرب کی

رہے جب تک ارکانِ اسلام برپا چلن اہلِ دیں کا رہا سیدھا سادا
رہا میل [2] سے شہد صافی مُصَفّا رہی کھوٹ سے سیم [3] خالص مُبَرّا

نہ تھا کوئی اسلام کا مردِ میداں
علم ایک تھا شش جہت میں دُرّ فشاں [4]

پہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا [5] کا گیا چھوٹ سر رشتہ [6] دینِ ہدیٰ کا
رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہُما [7] کا تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

برے اُن پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب وہ دنیا میں بس کر اُجڑنے لگے اب
بھرے اُن کے میلے بچھڑنے لگے اب بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب

ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھل گئی سارے عالَم پہ چھا کر

نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم وفن اُن سے ایک ایک رخصت مٹی خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت [8]

---

[1] کنونڈی: شرمندہ احسان۔ [2] میل: کچرا۔
[3] سیم: چاندی۔ [4] دُرّ فشاں: موتی پھیلانے والا۔
یورپ کے نامور مورخ شل اڈو، دگیں، ہنری لوئس، ہیلی سڈیلو وغیرہ اس بات کے معترف ہیں کہ ان کے علم وفضل کا سرچشمہ عرب تھا۔
[5] چشمہ صفا: اخلاص کا چشمہ۔
[6] سررشتہ: ڈوری۔
[7] ہما: ایک فرضی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا سایا جس پر پڑتا ہے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔
[8] نوبت بہ نوبت: یکے بعد دیگرے، ایک ایک کر کے۔

رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اُس پہ پھر اک خرد مند[1] دانا کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ
کہ عالم کو زیر و زبر[2] پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں[3]
بہت اُن سے کمتر، پہ سرسبز وخنداں[4] بہت خشک اور بے طراوت[5] مگر واں
نہیں لائے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سراسر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ[6] جس کے جلانے کے قابل

حکومت نے تم سے کیا گر کنارا[7] تو اس میں نہ تھا کچھ تمہارا اجارا[8]
زمانے کی گردش سے ہے کس کو چارا کبھی یاں سکندر کبھی یاں ہے دارا
نہیں بادشاہی کچھ آخر خدائی
جو ہے آج اپنی تو کل ہے پرائی

---

[1] خردمند: عقل مند۔
[2] زیروزبر: نیچے اوراوپر، درہم برہم۔
[3] رضواں: جنت۔
[4] خنداں: ہنستا ہوا۔
[5] بےطراوت: بغیر تازگی کے۔
[6] روکھ: درخت۔
[7] کنارا کرنا: علاحدگی کرنا۔
[8] اجارا: بس اور ارادہ۔

ہوئی مقتضی [1] جب کہ حکمت خدا کی کہ تعلیم جاری ہو خیر الوریٰ [2] کی
پڑے دھوم عالم میں دینِ ہدیٰ [3] کی تو عالم کی تم کو حکومت عطا کی
کہ پھیلاؤ دنیا میں حکمِ شریعت
کرو ختم بندوں پہ مالک کی حجت

ادا کر چکی جب حق اپنا حکومت رہی اب نہ اسلام کی اُس کو حاجت
مگر حیف اے فخرِ آدم کی امت ہوئی آدمیت بھی ساتھ اُس کے رخصت
حکومت تھی گویا کہ اک جھول [4] تم پر
کہ اُڑتے ہی اُس کے نکل آئے جوہر

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں [5] جہاں آ کے دیتا ہے رو اَبرِ نیساں [6]
تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغِ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا نشاں جس کا اقصائے عالم [7] میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا نہ عُمان [8] میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر

اگر کان دھر کر سنیں اہلِ عبرت تو سیلون سے تابہ کشمیر و تِبّت
زمیں روکھ بن پھول پھل ریت پربت یہ فریاد سب کر رہے ہیں بہ حسرت
کہ کل فخر تھا جن سے اہلِ جہاں کو
لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو

---

[1] مقتضی: آمادہ ہوئی۔
[2] تعلیم خیرالوریٰ: پیغمبر ﷺ کی تعلیم، اسلام کی تعلیم۔
[3] دینِ ہدیٰ: دین اسلام۔
[4] جھول: ڈھیلا پن۔
[5] باراں: بارش۔
[6] اَبرِ نیساں: وہ ابر جس کے قطروں سے موتی بنتے ہیں۔
[7] اقصائے عالم: اطراف عالم۔
[8] سیلون: سری لنکا۔

زمانے میں ہیں ایسی قومیں بہت سی نہیں جن میں تخصیص[1] فرماندہی[2] کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہو گی کہ گھر گھر پہ یاں چھا گئی آ کے پستی

چکور اور شہباز سب اوج[3] پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

وہ ملت کہ گردوں[4] پہ جس کا قدم تھا ہر ایک کھونٹ میں جس کا برپا عَلَم تھا
وہ فرقہ جو آفاق[5] میں محترم تھا وہ اُمت لقب جس کا خیرالامم تھا

نشان اُس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خُو میں

نہیں کوئی ذرہ نجابت[6] کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نامِ آبا[7] کو ہم سے گہن[8] ہے ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت[9] نہ اپنوں سے الفت، نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت[10] خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت

---

[1] تخصیص: خصوصیت۔ [2] فرماندہی: حکمرانی۔
[3] اوج: بلندی۔ [4] گردوں: آسمان۔
[5] آفاق: افق کی جمع، جہاں آسمان و زمین ملتے دکھائی دیتے ہیں مراد ساری دنیا۔
[6] نجابت: پاکیزگی۔ [7] آبا: اجداد۔
[8] گہن لگنا: بدنامی ہونا۔ [9] وقعت: عزت۔
[10] نخوت: غرور۔

عداوت نہاں ، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع [1] غرض کی مدارا [2]

نہ اہلِ حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ درباریوں میں سرفراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

تنزّل نے کی ہے بری گت ہماری بہت دور پہنچی ہے نکبت [3] ہماری
گئی گذری دنیا سے عزت ہماری نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے

سیاحت [4] کی گوں ہیں نہ مرد سفر ہیں خدا کی خدائی سے ہم بے خبر ہیں
یہ دیواریں گھر کی جو پیشِ نظر ہیں یہی اپنے نزدیک حدّ بشر ہیں
ہیں تالاب میں مچھلیاں کچھ فراہم
وہی اُن کی دنیا وہی اُن کا عالم

بہشت اور اِرَم [5]، سلسبیل [6] اور کوثر [7] پہاڑ اور جنگل ، جزیرے سمندر
اسی طرح کے اور بھی نام اکثر کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں برابر
پہ جب تک نہ دیکھیں کہیں کس یقین پر
کہ یہ آسماں پر ہیں یا ہیں زمیں پر

وہ بے مول پونجی کہ ہے اصل دولت وہ شائستہ ملکوں کا گنجِ سعادت
وہ آسودہ [8] قوموں کا راس البضاعت [9] وہ دولت کہ ہے وقت جس سے عبارت

---

[1] تواضع: خوشامد۔ [2] مدارا: خلوص۔
[3] نکبت: بدبختی۔ [4] سیاحت: مسافرت۔
[5] ارم: زمین پر بنائی گئی جنت۔ [6] سلسبیل: جنت کی نہر۔
[7] کوثر: سے مراد حوض کوثر ہے۔ [8] آسودہ: خوش حال۔
[9] راس البضاعت: پونجی، اصلی مال۔

نہیں اُس کی وقعت نظر میں ہماری
یونہیں مفت جاتی ہے بربادی ساری
اگر ہم سے مانگے کوئی ایک پیسا تو ہو گا کم و بیش بار اُس کا دینا
مگر ہاں وہ سرمایہ دین و دنیا کہ ایک ایک لمحہ ہے انمول جس کا
نہیں کرتے خِسّت [1] اُڑانے میں اُس کے
بہت ہم سخی ہیں لٹانے میں اُس کے
اگر سانس دن رات کے سب گنیں ہم تو نکلیں گے انفاس ایسے بہت کم
کہ ہو جن میں کل کے لیے کچھ فراہم یونہیں گزرے جاتے ہیں دن رات پیہم
نہیں کوئی گویا خبردار ہم میں
کہ یہ سانس آخر ہیں اب کوئی دم میں
گڈریے کا وہ حکم بردار کتا کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا
جو ریوڑ [2] میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بپھرا
جو انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر
وہ قومیں کہ سب راہ طے کر چکی ہیں ذخیرے ہر اک جنس کے بھر چکی ہیں
ہر ایک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہیں ہوئی تب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہیں
اسی طرح راہِ طلب میں ہیں پویا [3]
بہت دور ابھی اُن کو جانا ہے گویا
کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت [4] کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ کوئی لمحہ بے کار کھوتے نہیں وہ
نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

---

[1] خِسّت: کمینگی، کنجوسی۔ [2] ریوڑ: گلہ۔
[3] پویا: جستجو کرنا۔ [4] بضاعت: کمائی۔

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں جمادات کی طرح بارِ زمیں ہیں
جہاں میں ہیں ایسے کہ گویا نہیں ہیں زمانے سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے ، ایک باقی ہے مرنا

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی زمانے کی ساتھی ترقی کی حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

دکاں اُن کی ہے اور بازار اُن کا [1] بنج اُن کا ہے اور بہوار [2] اُن کا
زمانے میں پھیلا ہے بیوپار اُن کا ہے پیرو جوان برسرِکار اُن کا
[3] مدار اہلکاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس انہیں کے ہیں دفتر

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ گرامی [4] ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادت میں اطوار میں وہ نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشے سے حرفے سے انکار اُن کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار [5] اُن کو

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ پڑے زد [6] تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچے میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضےٰ [7] جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

---

[1] بنج: تجارت۔
[2] بہوار: لین دین، معاملات۔
[3] مدار: بھروسہ۔
[4] گرامی: محترم۔
[5] عار: دشمنی۔
[6] زد: مار۔
[7] مقتضےٰ: تقاضا۔

مگر ہے ہماری نظر اتنی اونچی کہ یکساں ہے سب واں بلندی و پستی
نہیں اب تک اصلاً خبر ہم کو یہ بھی کہ ہے کون مردار کتیا ترقی
جدھر کھول کر آنکھ ہم دیکھتے ہیں
زمانے کو اپنے سے کم دیکھتے ہیں

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ کہ ہے آشتی[1] میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

چمن میں ہوا آ چکی ہے خزاں کی پھری ہے نظر دیر سے باغباں کی
صدا اور ہے بلبل نغمہ خواں کی کوئی دم میں رحلت ہے اب گلستاں کی
تباہی کے خواب آ رہے ہیں نظر سب
مصیبت کی ہے آنے والی سحر اب

فلاکت[2] جسے کہیے اُم الجرائم[3] نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم[4] مصلّی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اہل اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

کہیں مکر کے گُر سکھاتی ہے ہم کو کہیں جھوٹ کی لَو لگاتی ہے ہم کو
خیانت کی چالیں سمجھاتی ہے ہم کو خوشامد کی گھاتیں بتاتی ہیں ہم کو
فسوں جب یہ پاتی نہیں کارگر وہ
تو کرتی ہے آخر کو دریوزہ[5] گر وہ

---

[1] آشتی: صلح۔ [2] فلاکت: افلاس۔
[3] اُمُّ الجرائم: جرموں کی ماں (جڑ)۔ [4] بہائم: جانور۔
[5] دریوزہ گر: بھیک مانگنے والا۔

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں ہزار اُن میں خوش ہیں تو دو بے نوا[1] ہیں
یہاں لاکھ میں دو اگر اغنیا[2] ہیں تو سو نیم بسمل ہیں باقی گدا ہیں
ذرا کام غیرت کو فرمائیں گر ہم
تو سمجھیں کہ ہیں مبتذل[3] کس قدر ہم

بگاڑے ہیں گردش نے جو خاندانی نہیں جانتے بس کہ روٹی کمانی
دلوں میں ہے یہ یک قلم سب نے ٹھانی کہ کیجیے بسر مانگ کر زندگانی
جہاں قدر دانوں کا ہیں کھوج پاتے
پہنچتے ہیں واں مانگتے اور کھاتے

کہیں باپ دادا کا ہیں نام لیتے کہیں روشناسی[4] سے ہیں کام لیتے
کہیں جھوٹے وعدوں پہ ہیں دام لیتے یونہیں ہیں وہ دے دے کے دم دام لیتے
بزرگوں کے نازاں ہیں جس نام پر وہ
اُسے بیچتے پھرتے ہیں در بدر وہ

یہ ہیں ڈھنگ اُن تازہ آفت زدوں کے بہت کم زمانہ ہوا جن کو بگڑے
ابھی ایک عالم ہے آگاہ جن سے کہ ہیں کس کے بیٹے وہ اور کس کے پوتے
جنہیں دیس پردیس سب جانتے ہیں
حسب اور نسب جن کا پہچانتے ہیں

مگر مٹ چکا جن کا نام و نشاں ہے پرانی ہوئی جن کی اب داستاں ہے
فسانوں میں قصوں میں جن کا بیاں ہے بہت نسل پر تنگ اُن کی جہاں ہے
نہیں ان کی قدر اور پرسش کہیں اب
انہیں بھیک تک کوئی دیتا نہیں اب

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے بہت گھانس کی گٹھریاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے بہت فاقے کر کر کے مر جانے والے

---

[1] بے نوا: بدبخت۔ [2] اغنیا: امیر ثروت مند۔
[3] مبتذل: ذلیل۔ [4] روشناسی: صورت دکھانا، نسب بتانا۔

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر
تو نکلیں گے نسل ملوک[1] اُن میں اکثر

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے انہیں کے پرستار[2] پیر و جواں تھے
یہی مامن[3] عاجز و ناتواں تھے یہی مرجع[4] دیلم و اصفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
انہیں کے گھروں میں تھی صاحبقرانی[5]

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے جسے دیکھیے مفلس و بے نوا[6] ہے
نہیں کوئی اُن میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

نہیں مانگنے کا طریق[7] ایک ہی یاں گدائی کی ہیں صورتیں نت نئی یاں
نہیں حصر[8] کنگلوں پہ گدیہ گری یاں کوئی دے تو منگتوں کی ہے کیا کمی یاں
بہت ہاتھ پھیلائے زیر ردا[9] ہیں
چھپے اُجلے کپڑوں میں اکثر گدا ہیں

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی
بہت آستانوں[10] کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں دَر دَر

---

[1] نسل ملوک: بادشاہوں کی اولاد۔
[2] پرستار: چاہنے والے۔
[3] مامن: امن کی جگہ، پناہ گاہ۔
[4] مرجع: شخصیت جس سے رجوع کیا جائے۔
[5] صاحب قرانی: وہ بادشاہ جس کی ولادت کے وقت زہرہ و مشتری ایک برج میں ہوں۔ کامران بادشاہ۔
[6] بے نوا: فقیر، بے سروسامان۔
[7] طریق: طریقہ۔
[8] حصر: محدود۔
[9] زیر ردا: چادر کے نیچے۔
[10] آستانوں: درگاہوں۔

مشقت کو محنت کو جو عار[1] سمجھیں ہنر اور پیشے کو جو خوار[2] سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں فرنگی[3] کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

کریں نوکری بھی ، تو بے عزتی کی جو روٹی کمائیں ، تو بے حرمتی کی
کہیں پائیں خدمت ، تو بے عزتی کی قسم کھایئے اُن کی خوش قسمتی کی
امیروں کے بنتے ہیں جب یہ مصاحب[4]
تو جاتے ہیں ہو کر حمیت[5] سے تائب[6]

کہیں اُن کی صحبت میں گانا بجانا کہیں مسخرہ بن کے ہنسنا ہنسانا
کہیں پھبتیاں[7] کہہ کے انعام پانا کہیں چھیڑ کر گالیاں سب سے کھانا
یہ کام اور بھی کرتے ہیں پر نہ ایسے
مسلمان بھائی سے بن آئیں جیسے

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے خمیر اُن کا اور اُن کی طینت[8] جدا ہے
سزا وار ہے اُن کو جو نا سزا ہے روا ہے انہیں سب کو جو نا روا ہے
شریعت ہوئی ہے نکو نام[9] اُن سے
بہت فخر کرتا ہے اسلام اُن سے

ہر اک بول پر اُن کے مجلس فدا ہے ہر اک بات پر واں درست اور بجا ہے
نہ گفتار میں اُن کی کوئی خطا ہے نہ کردار اُن کا کوئی نا سزا[10] ہے

---

[1] عار: بےکار۔
[2] خوار: ذلیل۔
[3] فرنگی: انگریز۔
[4] مصاحب: ساتھی۔
[5] حمیت: غیرت۔
[6] تائب: خالی، چھوڑ کر۔
[7] پھبتیاں: ظریف، چست فقرے۔
[8] طینت: فطرت۔
[9] نکونام: نیک نام۔
[10] ناسزا: ناروا، بےہودہ۔

وہ جو کچھ کہ ہیں کہہ سکے کون اُن کو
بنایا ندیموں [1] نے فرعون اُن کو

وہ دولت کہ ہے مایہ دین و دنیا وہ دولت کہ ہے توشہ راہِ عقبیٰ [2]
سلیماں نے کی جس کی حق سے تمنا بڑھا جس سے آفاق [3] میں نامِ کسریٰ [4]
کیا جس نے حاتم [5] کو مشہور دوراں [6]
کیا جس نے یوسف کو مسجودِ [7] اخواں

ملا ہے یہ فخر اُس کو اُن کی بدولت کہ سمجھی گئی ہے وہ اصل شقاوت [8]
کہیں ہے وہ سرمایہ جہل و غفلت کہیں نشہ بادہ کبر [9] و نخوت
جہاں کے لیے جو کہ آبِ بقا [10] ہے
وہ اس قوم کے حق میں سَمّی ہوا [11] ہے

ادھر مال و دولت نے یاں منھ دکھایا اُدھر ساتھ ساتھ اُس کے ادبار [12] آیا
پڑا آ کے جس گھر پہ ثروت کا سایہ عمل واں سے برکت نے اپنا اُٹھایا
نہیں راس یاں چار پیسے کسی کو
مبارک نہیں جیسے پر چیونٹی کو

سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو [13] بہائم سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چھپاتے ہیں اوباش [14] جن خصلتوں کو نہیں کرتے اجلاف [15] جن حرکتوں کو

---

[1] ندیموں: مصاحبوں، ساتھیوں۔
[2] راہ عقبیٰ: آخرت کا راستہ۔
[3] آفاق: آسمان۔
[4] کسریٰ: ایران کے قدیم بادشاہ۔
[5] حاتم: حاتم طائی۔
[6] دوراں: دنیا۔
[7] مسجود اخواں: جس کو بھائی سجدہ کریں۔
[8] شقاوت: ظلم و جبر، بدبختی۔
[9] کبر و نخوت: غرور اور تکبر۔
[10] آبِ بقا: آبِ حیات۔
[11] سمی: زہریلی۔
[12] ادبار: نحوست۔
[13] بہائم: جانور۔
[14] اوباش: ذلیل، بدمعاش۔
[15] اجلاف: کمینے لوگ۔

وہ یاں اہلِ دولت کو ہیں شیرِ مادر
نہ خوفِ خدا ہے نہ شرمِ پیمبر ﷺ

طبیعت اگر لَھو بازی [1] پہ آئی تو دولت بہت سی اسی میں لٹائی
جو کی حضرتِ عشق نے رہ نمائی تو کر دی بھرے گھر کی دم میں صفائی
پھر آخر لگے مانگنے اور کھانے
یونہیں مٹ گئے یاں ہزاروں گھرانے

نہ آغاز پر اپنے غور اُن کو اصلا نہ انجام کا اپنے کچھ اُن کو کھٹکا
نہ فکر اُن کو اولاد کی تربیت کا نہ کچھ ذلتِ قوم کی اُن کو پروا
نہ حق کوئی دنیا پہ اُن کا نہ دیں پر
خدا کو وہ کیا منھ دکھائیں گے جا کر

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر تو ہوتے ہیں مسخ [2] اُن میں پہلے توانگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر نہ عقل اُن کی ہادی نہ دیں اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا نہ مفلوک [3] کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس [4] میں خودی سے گزرنا تعیش [5] میں جینا نمایش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

پریشاں اگر قحط سے اک جہاں ہے تو بےفکر ہیں کیوں کہ گھر میں سماں ہے
اگر باغِ امت میں فصلِ خزاں ہے تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گل فشاں [6] ہے

---

[1] لہوبازی: کھیل کود۔
[2] مسخ: نابود۔
[3] مفلوک: مفلس۔
[4] ہواوہوس: خودپرستی، عیاشی۔
[5] تعیش: عیش کرنا۔
[6] گل فشاں: پھولوں سے بھرا۔

بنی نوع انساں کا حق اُن پہ کیا ہے
وہ اک نوع نوعِ بشر سے جدا ہے

کہاں بندگانِ ذلیل اور کہاں وہ بسر کرتے ہیں بے غم قوت ناں[1] وہ
پہنتے نہیں جز سمور[2] و کتاں وہ مکاں رکھتے ہیں رشک خلد و جناں وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں اُن کی گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں اُن کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں ان کی نزاکت سو داخل ہے عادت میں اُن کی
دواؤں میں مشک اُن کی اُٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

یہ ہو سکتے ہیں اُن کے ہم جنس[3] کیوں کر نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ[4] کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق[5] سے ہے جس کو رشتہ[6] وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

---

[1] قوت نان: روٹی خوراک۔
[2] سمور: لومڑی کی کھال۔
[3] ہم جنس: ساتھی، برابر۔
[4] کتابِ ہدیٰ: قرآن مجید۔
[5] خلایق: مخلوق خدا۔
[6] رشتہ وِلا: محبت کا رشتہ۔

عمل جن کا تھا اس کلامِ متیں [1] پر وہ سر سبز ہیں آج روئے زمیں پر
تفوّق [2] ہے اُن کو کہین و مہیں [3] پر مدار آدمیت کا ہے اب انہیں پر
شریعت کے جو ہم نے پیمان [4] توڑے
وہ لے جا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

سمجھتے ہیں گمراہ جن کو مسلماں نہیں جن کو عقبےٰ میں اُمیدِ غُفراں [5]
نہ حصے میں فردوس جن کے نہ رضواں نہ تقدیر میں حُور جن کے نہ غِلماں
پس از مرگ دوزخ ٹھکانا ہے جن کا
حمیم آب و زقوم [6] کھانا ہے جن کا

وہ ملک اور ملت پہ اپنی فدا ہیں سب آپس میں ایک اک کے حاجت روا [7] ہیں
اولوالعلم [8] ہیں اُن میں یا اغنیا ہیں طلب گار بہبودِ خلقِ خدا ہیں
یہ [9] تمغہ تھا گویا کہ حصہ انہیں کا
کہ حب الوطن ہے نشاں مومنیں کا

امیروں کی دولت غریبوں کی ہمت ادیبوں کی انشا [10]، حکیموں کی حکمت
فصیحوں کے خطبے شجاعوں کی جرأت سپاہی کے ہتھیار شاہوں کی طاقت
دلوں کی امیدیں ، اُمنگوں کی خوشیاں
سب اہل وطن اور وطن پر ہیں قرباں

عروج اُن کا جو تم عیاں دیکھتے ہو جہاں میں انہیں کامراں [11] دیکھتے ہو
مطیع اُن کا سارا جہاں دیکھتے ہو اُنہیں برتر از آسماں دیکھتے ہو

---

[1] کلام متین: قرآن مجید۔
[2] تفوق: فوقیت۔
[3] کہین و مہین: چھوٹا بڑا۔
[4] فرمان: عہد، وعدہ۔
[5] امیدِ غفراں: امید مغفرت۔
[6] حمیم آب وزقوم: حمیم گرم پانی جو دوزخیوں کو پلایا جائے گا اور زقوم تھور جو ان کو کھلایا جائے گا۔
[7] حاجت روا: ضرورت پورا کرنے والا۔
[8] اولوالعلم: علما۔
[9] تمغہ: میڈل۔
[10] انشا: تحریر۔
[11] کامراں: کامیاب۔

یہ ثمرے[1] ہیں اُن کی جوان مردیوں کے
نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

غنی ہم میں ہیں جو کہ اربابِ ہمت مُسَلَّم ہے عالم میں جن کی سخاوت
اگر ہے مشائخ[2] سے اُن کو عقیدت تو ہے پیر زادوں پہ وقف اُن کی دولت
نکمے ہیں دن رات واں عیش کرتے
پہ نوکر ہیں جتنے وہ بھوکے ہیں مرتے

عمل واعظوں کے اگر قول پر ہے تو بخشش کی امید بے صرف زر[3] ہے
نماز اور روزے کی عادت اگر ہے تو روز حساب اُن کو پھر کس کا ڈر ہے
اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی
تو فردوس میں نیو[4] اپنی جمادی

عمارت کی بنیاد ایسی اُٹھانی نہ نکلے کہیں ملک میں جس کا ثانی
تماشوں میں ثروت بڑوں کی اُڑانی نمائش میں دولت خدا کی لٹانی
چھٹی بیاہ میں کرنے لاکھوں کے ساماں
یہ ہیں اُن کے ارماں یہ ہیں اُن کی خوشیاں

مگر دینِ برحق کا بوسیدہ ایواں تزلزل میں مدت سے ہیں جس کے ارکاں
زمانے میں ہے جو کوئی دن کا مہماں نہ پائیں گے ڈھونڈا جسے پھر مسلماں
عزیزوں نے اُس سے توجہ اُٹھا لی
عمارت کا ہے اُس کے اللہ والی

پڑی ہیں سب اُجڑی ہوئی خانقاہیں وہ درویش و سلطاں کی اُمید گاہیں
کھلی تھیں جہاں علمِ باطن کی راہیں فرشتوں کی پڑتی تھیں جن پر نگاہیں

---

[1] ثمرے: پھل۔ [2] مشائخ: اولیا، شیوخ۔
[3] بے صرف زر: سونا خرچ کیے بغیر۔ [4] نیو: بنیاد۔

کہاں ہیں وہ جذبِ الٰہی[1] کے پھندے
کہاں ہیں وہ اللہ کے پاک بندے

وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں وہ اخبارِ دیں کے مُبَصِّر کدھر ہیں
اُصولی کدھر ہیں مُناظر کدھر ہیں مُحدِّث کہاں ہیں مُفَسِّر کدھر ہیں

وہ مجلس جو کل سر بسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

مدارس وہ تعلیمِ دیں کے کہاں ہیں مراحل وہ علم و یقیں کے کہاں ہیں
وہ ارکان شرعِ متیں کے کہاں ہیں وہ وارث رسول امیں کے کہاں ہیں

رہا کوئی امت کا ملجا[2] نہ ماویٰ[3]
نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا

کہاں ہیں وہ دینی کتابوں کے دفتر کہاں ہیں وہ علمِ الٰہی کے منظر
چلی ایسی اس بزم میں بادِ صرصر[4] بجھیں مشعلیں نورِ حق کی سراسر

رہا کوئی ساماں نہ مجلس میں باقی
صراحی نہ طنبور[5] مُطرِب نہ ساقی

بہت لوگ بن کر ہوا خواہِ[6] امت سفیہوں[7] سے منوا کے اپنی فضیلت
سدا گاؤں در گاؤں نوبت بہ نوبت پڑے پھرتے ہیں کرتے تحصیل[8] دولت

یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارث انبیا اب

---

[1] جذبِ الٰہی: عرفان اور تصوف کے عمل۔
[2] ملجا: پناہ کی جگہ۔
[3] ماویٰ: ٹھکانہ۔
[4] بادِ صرصر: آندھی۔
[5] طنبور: ایک قسم کا ستار۔
[6] ہواخواہ: طرف دار۔
[7] سفیہوں: کمینوں۔
[8] تحصیل: حاصل کرنا۔

بہت لوگ پیروں کیا اولاد بن کر نہیں ذات والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر کہ تھے ان کے اسلاف[1] مقبولِ داور

کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت[2] مقام ان کا ہے ماورائے شریعت[3]
انہیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت[4] انہیں کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت

یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید[5] اور یہی با یزید اب[6]

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر[7] کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کوئی مسئلہ پوچھنے اُن سے جائے تو گردن پہ بار گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے تو قطعی[8] خطاب اہل دوزخ کا پائے

اگر اعتراض اُس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پُھلاتے کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منھ پہ لاتے
کبھی خوک[9] اور سگ[10] ہیں اُس کو بناتے کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے

---

[1] اسلاف: اجداد۔
[2] راہ طریقت: راہ تصوف (صوفی)۔
[3] ماورائے شریعت: شریعت سے جدا۔
[4] کشف وکرامات: کمال اور معجزے۔
[5] جنید: جنید بغدادی تیسری صدی کے صوفی تھے۔
[6] بایزید: بایزید بسطامی تیسری صدی کے صوفی تھے۔
[7] تکفیر: کافر قرار دینا۔
[8] قطعی: قطعًا۔
[9] خوک: خنزیر، سور۔
[10] سگ: کتا۔

ستوں چشم بد دُور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

جو چاہے کہ خوش اُن سے مل کر ہو انساں تو ہے شرط وہ قوم کا ہو مسلماں
نشاں سجدے کا ہو جبیں پر نمایاں تَشَـــرُّع [1] میں اُس کے نہ ہو کوئی نقصاں
لبیں [2] بڑھ رہی ہوں نہ ڈاڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

عقائد میں حضرت کا ہمداستاں ہو ہر اک اصل میں فرع [3] میں ہم زباں ہو
حریفوں سے اُن کے بہت بدگماں ہو مریدوں کا اُن کے بڑا مدح خواں ہو
گر ایسا نہیں ہے تو مردود دیں ہے
بزرگوں سے ملنے کے قابل نہیں ہے

شریعت کے احکام تھے وہ گوارا کہ شیدا تھے اُن پر یہود اور نصاریٰ
گواہ اُن کی نرمی کا قرآن ہی سارا خود اَلـــدِّیْـــنُ یُسْـــرٌ [4] نبی نے پکارا
مگر یاں کیا ایسا دشوار اُن کو
کہ مومن سمجھنے لگے بار ان کو

نہ کی اُن کی اخلاق میں رہنمائی نہ باطن میں کی اُن کے پیدا صفائی
پہ احکام ظاہر کی لے یہ بڑھائی کہ ہوتی نہیں اُن سے دم بھر رہائی
وہ دیں جو کہ چشمہ تھا خُلق نکو [5] کا
کیا قُـلّتیـن [6] اُس کو غسل و وضو کا

---

[1] تشرع: شریعت پہ عمل کرنا۔
[2] لبیں: ہونٹ کے اوپر کے مونچھ کے بال۔
[3] فرع: ثانوی۔
[4] اَلدِّیْنُ یُسْرٌ: دین میں آسانیاں ہیں۔
[5] خلق نکو: نیک اخلاق۔
[6] قلتین: پانی جو حوض یا برتن میں ہو جس کی پاکیزگی کے بارے میں اسلام کے فرقوں میں تضاد ہے۔

سدا اہل تحقیق سے دل میں بل ہے حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں [1] پہ بالکل مدارِ عمل ہے ہر اک رائے قرآن کا نعم البدل [2] ہے

کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

جہاں مختلف ہوں روایات باہم کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلم اُسے ہر روایت سے سمجھیں مقدم

سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں
سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

کرے غیر گربت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب [3] میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں

نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ہوا جلوہ [4] گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں

ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

---

[1] فتاووں: فتوے۔ [2] نعم البدل: اچھا بدلہ جو کسی شئے کے بدل میں حاصل ہو۔
[3] کواکب: تارے۔ [4] جلوہ گر: نمایاں۔

تعصب کہ ہے دشمن نوع انساں بھرے گھر کیے سیکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزم نمرود [1] جس سے پریشاں کیا جس نے فرعون [2] کو نذر طوفاں
گیا جوش میں بو لہب [3] جس کے کھویا
ابو جہل [4] کا جس نے بیڑا ڈبویا

وہ یاں اک عجب بھیس میں جلوہ گر ہے چھپا جس کے پردے میں اُس کا ضرر ہے
بھرا زہر جس جام میں سر بسر ہے وہ آبِ بقا ہم کو آتا نظر ہے
تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم
جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے
مخالف کی رِیس [5] اس میں کرنی بری ہے نشاں غیرت دین حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک اُس کی ہرگز کوئی بات سمجھو
وہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر اُس کا پاؤ تو تم سیدھے رستے سے کترا کے جاؤ
پڑیں اس میں جو دقتیں وہ اُٹھاؤ لگیں جس قدر ٹھوکریں اُس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اُس کا بچ کر بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ [6] ہو جائے صورت تمہاری بہائم [7] میں مل جائے سیرت تمہاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری سراسر بگڑ جائے حالت تمہاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نور ایمان یہ بھی

---

[1] نمرود: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مخالف۔
[2] فرعون: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخالف۔
[3] بولہب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ختمی مرتبت کا مخالف۔
[4] ابوجہل: رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا مخالف۔
[5] ریس: تائید، تقلید۔
[6] مسخ: مٹ جانا۔
[7] بہائم: جانور۔

نہ اوضاع[1] میں تم سے نسبت کسی کو نہ اخلاق میں تم پہ سبقت[2] کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو نہ پیدا یہ پوشش یہ زینت کسی کو
تمہیں فضل ہر علم میں برملا[3] ہے
تمہاری جہالت میں بھی اک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بری تم رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جب کہ اسلام کی تم تو ہر ہر بدی اور گنہ سے بری[4] تم
بدی سے نہیں مومنوں کو مضرت[5]
تمہارے گنہ اور نہ اوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجیے تو ذکر اُس کا ذلت سے خواری سے کیجیے
کبھی بھول کر طرح اس میں نہ دیجیے قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا[6]
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پر ہنسے سارا عالم

کرے کوئی اصلاح کا گر ارادہ تو شیطان سے اُس کو سمجھو زیادہ
جسے ایسے مفسد[7] سے ہے استفادہ رہ حق سے ہے برطرف اُس کا جادہ[8]
شریعت کو کرتے ہیں برباد دونوں
ہیں مردود شاگرد و استاد دونوں

---

[1] اوضاع: حالات۔ [2] سبقت: برتری۔
[3] برملا: سب کے سامنے۔ [4] بری: دور، پاک۔
[5] مضرت: نقصان۔ [6] مُبرّا: پاک۔
[7] مفسد: فساد کرنے والا۔ [8] جادہ: راستہ۔

وہ دیں جس نے الفت کی بنیاد ڈالی کیا طبع دوراں کو نفرت سے خالی
بنایا اجانب [1] کو جس نے موالی [2] ہر اک قوم کے دل سے نفرت نکالی
عرب اور حبش ترک تاجیک [3] و دیلم [4]
ہوئے سارے شیر و شکر مل کے باہم

تعصب نے اُس صاف چشمے کو آ کر کیا بغض کے خارو خس سے مکدر
بنے خصم جو تھے عزیز اور برادر نفاق اہل قبلہ میں پھیلا سراسر
نہیں دستیاب ایسے اب دس مسلماں
کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے مصیبت میں یاروں کے غم خوار ہوتے
سب ایک ایک کے باہم مددگار ہوتے عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں یوں ہوتے ثابت قدم ہم
تو کہہ سکتے اپنے کو خیر الامم [5] ہم

اگر بھولتے ہم نہ قول پیغمبر ﷺ کہ ''ہیں سب مسلمان باہم برادر''
برادر ہے جب تک برادر کا یاور معین اُس کا ہے خود خداوند داور
تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

وہ گھر جس میں ہوں دل ملے سب کے باہم خوشی نا خوشی میں ہوں سب یار و ہمدم
اگر ایک خوش دل تو گھر سارا خرم [6] اگر ایک غمگیں تو دل سب کے پر غم
مبارک ہے اُس قصر [7] شاہنشی سے
جہاں ایک دل ہو مکدر کسی سے

---

[1] اجانب: غیر، دوسرے۔
[2] موالی: دوست۔
[3] تاجیک: تاجکستان کا باشندہ۔
[4] دیلم: شمالی ایران کے افراد۔
[5] خیرالامم: سب اُمتوں سے بہتر۔
[6] خرم: خوشحال۔
[7] قصر: محل۔

اگر ہو مدار[1] اس پہ تحقیق دیں کا کہ ہے دین والوں کا برتاؤ کیسا؟
کھرا اُن کا بازار رہے یا کہ کھوٹا ہے قول و قرار اُن کا جھوٹا کہ سچا
تو ایسے نمونے بہت شاذ[2] ہیں یاں
کہ اسلام پر جن سے قائم ہو برہاں[3]

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے نہ ملّا کو صوفی کو اس سے حذر[4] ہے
اگر نشہ مئے[5] ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں

جنہیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں
موافق نہیں جن سے ایام دوراں نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں
نشے میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

اگر مرجعِ خلق[6] ہے ایک بھائی نہیں ظاہراً کوئی اُس میں برائی
بھلا جس کو کہتی ہے ساری خدائی ہر اک دل میں عظمت ہے جس کی سمائی
تو پڑتی ہے اُس پر نگاہیں غضب کی
کھٹکتا ہے کانٹا سا آنکھوں میں سب کی

بگڑتا ہے جب قوم میں کوئی بن کر ابھی بخت و اقبال تھے جن کے یاور
ابھی گردنیں جھکتی تھیں جس کے در پر مگر کر دیا اب زمانے نے بے پر
تو ظاہر میں کڑھتے ہیں پر خوش ہیں جی میں
کہ ہمدرد ہات آیا اک مفلسی میں

---

[1] مدار: تکیہ۔ [2] شاذ: کم۔
[3] برہاں: دلیل۔ [4] حذر: چھٹکارا۔
[5] نشہ مئے: شراب کا نشہ۔ [6] مرجعِ خلق: لوگوں کا رہنما مرکز۔

اگر اک جوان مرد ہمدرد انساں کرے قوم پر دل سے جان اپنی قرباں
تو خود قوم اُس پر لگائے یہ بہتاں[1] کہ ہے اُس کی کوئی غرض اس میں پنہاں
وگرنہ پڑی کیا کسی کو کسی کی
یہ چالیں سراسر ہیں خود مطلبی[2] کی
نکالے گر اُن کی بھلائی کی صورت تو ڈالیں جہاں تک بنے اُس میں کھنڈت[3]
سنیں کامیابی کی گر اُس کی شہرت تو دل سے تراشیں کوئی تازہ تہمت
منھ اپنا ہو گر دین و دنیا میں کالا
نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا
اگر پاتے ہیں دو دلوں میں صفائی تو ہیں ڈالتے اُس میں طرح جدائی
ٹھنی دو گروہوں میں جس دم لڑائی تو گویا تمنا ہماری بر آئی
بس اس سے نہیں مشغلہ خوب کوئی
تماشا نہیں ایسا مرغوب[4] کوئی
تغلب[5] میں بد نیتی میں دغا[6] میں نمود اور بناوٹ فریب اور ریا[7] میں
سعایت[8] میں بہتان[9] میں افترا[10] میں کسی بزم بیگا نہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے
بڑھے پھر نہ کیوں شان اسلام ہم سے
خوشامد میں ہم کو وہ قدرت ہے حاصل کہ انساں کو کرتے ہیں ہر طرح مائل
کہیں احمقوں کو بناتے ہیں عاقل کہیں ہوشیاروں کو کرتے ہیں غافل

---

[1] بہتاں: تہمت۔
[2] خود مطلبی: خودخواہی۔
[3] کھنڈت: مزاحمت، خرابی۔
[4] مرغوب: پسندیدہ۔
[5] تغلب: دھوکا۔
[6] دغا: فریب۔
[7] ریا: مکاری۔
[8] سعایت: چغل خوری۔
[9] بہتان: تہمت۔
[10] افترا: جھوٹ باندھنا۔

کسی کو اُتارا کسی کو چڑھایا
یونہیں سیکڑوں کو اسامی [1] بنایا

روایات [2] پر حاشیہ اک چڑھانا قسم جھوٹے وعدوں پہ سو بار کھانا
اگر مدح کرنا تو حد سے بڑھانا مذمت پہ آنا تو طوفاں اُٹھانا
یہ ہے روز مرہ کا یاں اُن کے عنواں
فصاحت میں بے مثل ہیں جو مسلماں

اُسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے اَن بَن سمجھتے ہیں ہم رہنماؤں کو رہزن [3]
یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

وہ عہد ہمایوں جو خیر القروں [4] تھا خلافت کا جب تک کہ قائم ستوں تھا
نبوت کا سایہ ابھی رہنموں تھا سماں خیر و برکت کا ہر دم فزوں [5] تھا
عدالت کے زیور سے تھے سب مزین
پھلا اور پھولا تھا احمد کا گلشن

سعادت بڑی اس زمانے کی یہ تھی کہ جھکتی تھی گردن نصیحت پہ سب کی
نہ کرتے تھے خود قول حق سے خاموشی نہ لگتی تھی حق کی انہیں بات کڑوی
غلاموں سے ہو جاتے تھے بند آقا
خلیفہ سے لڑتی تھی ایک ایک بڑھیا

نبی نے کہا تھا جنہیں فخر امت جنہیں خلد کی مل چکی تھی بشارت
مسلم تھی عالم میں جن کی عدالت رہا مفتخر [6] جن سے تخت خلافت

---

[1] اسامی: مالدار۔ [2] روایات: سرگزشت، واقعات۔
[3] رہزن: ڈاکو۔ [4] خیرالقروں: سب سے بہتر زمانہ۔
[5] فزوں: زیادہ۔ [6] مفتخر: جس پر فخر کیا جا سکے۔

وہ پھرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کے در در
کہ شرمائیں اپنا کہیں عیب سن کر

مگر ہم کو ہیں دام و دد[1] ہم سے بہتر نہ ظاہر کہیں ہم میں خوبی نہ مضمر[2]
نہ اقران[3] و امثال میں ہم موقر[4] نہ اجداد و اسلاف کے ہم میں جوہر

نصیحت سے ایسا برا مانتے ہیں
کہ گویا ہم اپنے کو پہچانتے ہیں

نبوت نہ گر ختم ہوتی عرب پر کوئی ہم پہ مبعوث ہوتا پیمبر
تو ہے جیسے مذکور قرآں کے اندر ضلالت یہود اور نصاریٰ کی اکثر

یونہیں جو کتاب اس پیمبر پہ آتی
وہ گمراہیاں سب ہماری جتاتی

ہنر ہم میں جو ہیں وہ معلوم ہیں سب علوم اور کمالات معدوم[5] ہیں سب
چلن اور اطوار مذموم[6] ہیں سب فراغت سے دولت سے محروم ہیں سب

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر
تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر

وہ تقویمِ[7] پارینہ یونانیوں کی وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نکمی عمل نے جسے کر دیا آ کے ردی

اسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ
کوئی بات اُس میں نہیں کم زیادہ

زبور اور توریت و انجیل و قرآں بالاجماع[8] ہیں قابل نسخ و نسیاں[9]
مگر لکھ گئے جو اُصول اہل یوناں نہیں نسخ و تبدیل کا اُن میں امکاں

---

[1] دام ودد: مویشی اور حیوانات۔
[2] مضمر: پوشیدہ۔
[3] اقران وامثال: ہم عصر اور ہم عمر لوگ۔
[4] موقر: عزت دار۔
[5] معدوم: خالی۔
[6] مذموم: خراب۔
[7] تقویمِ پارینہ: قدیم جنتری۔
[8] بالاجماع: سب کی نظر میں۔
[9] نسخ ونسیاں: غلط اور جھوٹ۔

نہیں مٹتے جب تک کہ آثار دنیا
مٹے گا کبھی کوئی شوشہ نہ اُن کا

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہیں نقش اہل یوناں کی رائیں
جو اب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں

اب اس فلسفے پر ہیں جو مرنے والے شفا[1] اور مجسطی[2] کے دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے فلاطون کی اقتدا[3] کرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

وہ جب کر چکے ختم تحصیل حکمت بندھی سر پہ دستار علم و فضیلت
اگر رکھتے ہیں کچھ طبیعت میں جودت[4] تو ہے سب سے اُن کی بڑی یہ لیاقت
کہ گردن کو وہ رات کہہ دیں زباں سے
تو منوا کے چھوڑیں اُسے اک جہاں سے

سوا اس کے جو آئے اُس کو پڑھا دیں انہیں جو کچھ آتا ہے اُس کو بتا دیں
وہ سیکھے ہیں جو بولیاں سب سکھا دیں میاں مٹھو اپنا سا اُس کو بنا دیں
یہ لے دے کے ہے علم کا اُن کے حاصل
اسی پر ہے فخر اُن کو بین الاماثل[5]

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ[6] چرانے کے قابل نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل

---

[1] شفا: بوعلی سینا کی کتاب۔ [2] مجسطی: حکیم بطلیموس کی کتاب علم ریاضی میں ہے۔
[3] اقتدا: تقلید۔ [4] جودت: اچھائی۔
[5] بین الاماثل: ہم عصر لوگوں کے درمیان۔ [6] ریوڑ: گلہ۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے مراد آپ کی اس کے پڑھنے سے کیا ہے
مفاد[1] اس میں دنیا کا یا دین کا ہے نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے
تو مجذوب[2] کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اُس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآں کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ
دلیلیں ہیں سب آج بے کار اُن کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار اُن کی

پڑے اُس مشقت میں ہیں وہ سراپا نتیجہ نہیں اُن کو معلوم جس کا
گئیں بھول آگے کی بھیڑیں جو بٹیا[3] اُسی راہ پر پڑ لیا سارا گلا
نہیں جانتے یہ کہ جاتے کدھر ہیں
گئے بھول رستہ وہ یا راہ پر ہیں

مثال اُن کی کوشش کی ہے صاف ایسی کہ کھائی کہیں بندروں نے جو سردی
ادھر اور اُدھر دیر تک آگ ڈھونڈی کہیں روشنی اُن کو پائی نہ اُس کی
مگر ایک جگنو چمکتا جو دیکھا
پتنگا اُسے آگ کا سب سے سمجھا

لیا جا کے تھام اور سب نے اُسی دم کیا گھانس پھونس اُس پہ لا کر فراہم
لگے اُس کو سلگانے سب مل کے پیہم یہ کچھ آگ سلگی نہ سردی ہوئی کم

---

[1] مفاد: فایدہ۔
[2] مجذوب: صوفی، درویش۔
[3] بٹیا: کھیتوں کا راستہ، پگ ڈنڈی۔

یونہیں رات ساری انہوں نے گنوائی
مگر اپنی محنت کی راحت نہ پائی

گزرتے تھے جو جانور اس طرف سے جب اس کشمکش میں انہیں دیکھتے تھے
ملامت بہت سخت تھے اُن کو کرتے کہ شرمائیں وہ زعم[1] باطل سے اپنے
مگر اپنی کد[2] سے نہ باز آتے تھے وہ
ملامت پہ اور اُلٹے غراتے تھے وہ

نہ سمجھے وہ جب تک ہوا دن نہ روشن اسی طرح جو ہیں حقیقت کے دشمن
نہ جھاڑیں گے گردِ توہم[3] سے دامن پہ جب ہو گا نور سحر لمعہ[4] افگن
بہت جلد ہو جائے گا آشکارا
کہ جگنو کو سمجھے تھے وہ اک شرارا

وہ طب جس پہ غش ہیں ہمارے اطبا سمجھتے ہیں جس کو بیاض مسیحا
بتانے میں ہے بخل[5] جس کے بہت سا جسے عیب کی طرح کرتے ہیں اخفا[6]
فقط چند نسخوں کا ہے وہ سفینہ
چلے آئے ہیں جو کہ سینہ بسینہ

نہ اُن کو نباتات سے آگہی[7] ہے نہ اصلا خبر معدنیات کی ہے
نہ تشریح کی لے کسی پر کھلی ہے نہ علم طبیعی نہ کمیسٹری ہے
نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے
مریضوں کا اُن کے نگہباں خدا ہے

---

[1] زعم: گمان۔
[2] کد: رنج، سختی۔
[3] توہم: شک، گمان۔
[4] لمعہ افگن: شعلہ ور۔
[5] بخل: کنجوسی۔
[6] اخفا: چھپانا۔
[7] آگہی: واقفیت۔

نہ قانون میں اُن کے کوئی خطا ہے نہ مخزن[1] میں انگشت رکھنے کی جا ہے
سدیدی[2] میں لکھا ہے جو کچھ بجا ہے نفیسی[3] کے ہر قول پر جاں فدا ہے
سلف[4] لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس[5] سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث[6] جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے مین جتنے قلی[7] اور نفر ہیں کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور[8] ہیں
گویے امیروں کے نورِ نظر ہیں ڈفالی[9] بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق[10] میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقے[11] نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو تُھڑ[12] جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب

---

[1] مخزن: پرانی طب کی کتاب۔ [2] سدیدی: قدیم اطبا کی کتابیں۔
[3] نفیسی: قدیم طبی کتاب۔ [4] سلف: اجداد۔
[5] سنڈاس: فضلہ۔ [6] عبث: بے وجہ۔
[7] قلی: سامان اٹھانے والا۔ [8] بہرہ ور: فایدہ مند۔
[9] ڈفالی: دف بجانے والا۔ [10] تپ دق: دق کا بخار۔
[11] سقے: پانی بھرنے والا۔ [12] تُھڑ جانا: کم ہو جانا۔

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم[1] جہاں پاک سارے

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جن کی فصاحت تھی مانی مٹا دی عزیزوں نے اُن کی نشانی
سب اُن کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے جِلا[2] دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سناں[3] کے لیے کام انہوں نے لساں سے زبانوں کے کوچے تھے بڑھ کر سناں سے
ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل[4]
پڑی اُن کے خطبوں سے دنیا میں ہل چل

خلف[5] اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں تو لے دے کے گوں[6] یہاں ہیں
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ[7] اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

طوائف کو ازبر[8] ہیں دیوان اُن کے گویوں پہ بے حد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں[9] میں ارمان اُن کے ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال انہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنہوں نے

---

[1] خس کم: کچرا کم ہوگا۔
[2] جلا: زندہ ہونا، زندگی۔
[3] سناں: نیزہ۔
[4] صیقل: چمکانا۔
[5] خلف: اولاد۔
[6] گوں: طرح۔
[7] بھانڈ: گویے۔
[8] ازبر: زبانی۔
[9] تکیوں: درگاہوں کے مقام۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ اُن کی حالت بری اُن کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو [1] کا رسیا ہے کوئی

سدا گرم انفار [2] سے ان کی صحبت ہر اک رندو اوباش [3] سے اُن کی ملت
پڑھے لکھوں کے سائے سے اُن کو وحشت مدارس سے تعلیم سے اُن کو نفرت
کمینوں کے جرگے [4] میں عمریں گنوانی
اُنہیں گالیاں دینی اور آپ کھانی

نہ علمی مدارس میں ہیں اُن کو پاتے نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے
پہ میلوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے
کتاب اور معلم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

اگر کیجیے اُن پاک شہدوں کی گنتی ہوا جن کے پہلو سے بچ کر ہے چلتی
ملی خاک میں جن سے عزت بڑوں کی مٹی خاندانوں کی جس سے بزرگی
تو یہ جس قدر خانہ برباد ہوں گے
وہ سب ان شریفوں کی اولاد ہوں گے

ہوئی اُن کی بچپن میں یوں پاسبانی [5] کہ قیدی کی جیسے کٹے زندگانی
لگی ہونے جب کچھ سمجھ بوجھ سیانی [6] چڑھی بھوت کی طرح سر پر جوانی
بس اب گھر میں دشوار تھمنا ہے اُن کا
اکھاڑوں میں تکیوں میں رمنا [7] ہے اُن کا

---

[1] مدک چنڈو: نشہ آور چیزیں۔ [2] انفار: لوگ۔
[3] اوباش: رذیل، بدمعاش۔ [4] جرگے: آدمیوں کا ہجوم۔
[5] پاسبانی: حفاظت۔ [6] سیانی: سمجھدار۔
[7] رمنا: بسیرا، اڈا۔

نشے میں مے عشق کے چور ہیں وہ صف فوج مژگاں[1] میں محصور ہیں[2] وہ
غم چشم و ابرو میں رنجور[3] ہیں وہ بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ
کریں کیا کہ ہے عشق طینت[4] میں اُن کی
حرارت بھری ہے طبیعت میں اُن کی

اگر شش جہت[5] میں کوئی دل رُبا ہے تو دل اُن کا نادیدہ[6] اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اُس کی دن رات نام خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں

اگر ماں ہے دُکھیا تو اُن کی بلا سے اپاہج[7] ہے باوا تو اُن کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو اُن کی بلا سے جو مرتا ہے کنبا تو اُن کی بلا سے
جنہوں نے لگائی ہو لو دل رُبا سے
غرض پھر انہیں کیا رہی ماسوا سے

نہ گالی سے دُشنام[8] سے جی چُرائیں نہ جوتی سے پیزار[9] سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لچپن[10] دکھائیں جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش اُن کی ہنسی سے
گریزاں[11] ہیں رند اُن کی ہمسایگی سے

سپوتوں[12] کو اپنے اگر بیاہ دیجے تو بہوؤں کا بوجھ اپنی گروں پہ لیجے
جو بیٹی کے پیوند کی فکر کیجے تو بد راہ ہیں بھانجے اور بھتیجے

---

[1] مژگاں: پلکیں۔ [2] محصور: قید۔
[3] رنجور: غم زدہ۔ [4] طینت: طبیعت۔
[5] شش جہت: چھے سمت۔ [6] نادیدہ: بغیر دیکھے۔
[7] اپاہج: معذور۔ [8] دشنام: برا کہنا۔
[9] پیزار: کفش، جوتے۔ [10] لچپن: بہبودگی۔
[11] گریزاں: فرار۔ [12] سپوتوں: بیٹوں۔

یہی جھینکنا کُو بہ کُو گھر بہ گھر ہے
بہو کو ٹھکانا نہ بیٹی کو بر ہے

نہ مطلب نگاری کا ان کو سلیقہ نہ دربار داری کا ان کو سلیقہ
نہ امیدواری کا ان کو سلیقہ نہ خدمت گزاری کا ان کو سلیقہ
قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر ان کو کس مد[1] میں کوئی کھپائے

نہیں ملتی روٹی جنہیں پیٹ بھر کے وہ گزران کرتے ہیں سو عیب کر کے
جو ہیں اُن میں دو چار آسودہ گھر کے وہ دن رات خواہاں ہیں مرگِ پدر کے
نمونے یہ اعیان و اشراف[2] کے ہیں
سلف ان کے وہ تھے خلف اُن کے یہ ہیں

وہ اسلام کی پود[3] شاید یہی ہے کہ جس کی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آیندہ چشم بہی ہے بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے
یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں؟
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں

یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری کہ بخشیں گی جو دین کو اُستواری
کریں گی یہی قوم کی غمگساری انہیں پر امیدیں ہیں موقوف ساری
یہی شمعِ اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی

خلف اُن کے الحق[4] اگر یاں یہی ہیں سلف کے اگر فاتحہ خواں یہی ہیں
اگر یادگارِ عزیزاں یہی ہیں اگر نسل اشراف و اعیاں یہی ہیں

---

[1] مد: زمرے، حصے۔ [2] اعیان واشراف: امرااورشرفا۔
[3] پود: نسل۔ [4] الحق: جق کی قسم۔

تو یاد اس قدر ان کی رہ جائے گی یاں
کہ اک قوم رہتی تھی اس نام کی یاں

سمجھتے ہیں شائستہ جو آپ کو یاں ہیں آزادی رائے پر جو کہ نازاں
چلن پر ہیں جو قوم کے اپنی خنداں[1] مسلماں ہیں سب جن کے نزدیک ناداں

جو ڈھونڈو گے یاروں کے ہمدرد اُن میں
تو نکلیں گے تھوڑے جواں مرد اُن میں

نہ رنج اُن کے افلاس کا اُن کو اصلا نہ فکر اُن کی تعلیم اور تربیت کا
نہ کوشش کی ہمت نہ دینے کو پیسا اُڑانا مگر مفت ایک اک کا خاکا

کہیں اُن کی پوشاک[2] پر طعن کرنا
کہیں اُن کی خوراک کو نام دھرنا

عزیزوں کی جس بات میں عیب پانا نشانہ اُسے پھبتیوں[3] کا بنانا
شماتت[4] سے دل بھائیوں کا دُکھانا یگانوں کو بیگانہ بن کر چڑانا

نہ کچھ درد کی چوٹ اُن کے جگر میں
نہ قطرہ کوئی خون کا چشمِ تر میں

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے پڑا جس سے جوکھوں[5] میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے کوئی اُن میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں اُن پہ خندہ زناں[6] ہیں

کوئی اُن سے پوچھے کہ اے ہوش والو کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
بُرا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

---

[1] خنداں: ہنستے ہوئے۔
[2] پوشاک: لباس۔
[3] پھبتیوں: مسخرے جملے۔
[4] شماتت: شرم دلانا۔
[5] جوکھوں: خطروں۔
[6] خندہ زناں: ہنسنے والے۔

بچو گے نہ تم اور ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

غرض عیب کیجے بیاں اپنے کیا کیا کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے[1] کا آوا
فقیہہ اور جاہل ضعیف اور توانا تَـــاسُّف[2] کے قابل ہے احوال سب کا

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا ''عقل جس سے ملے دین و دنیا'' کہا ''گر نہ ہو اُس سے انساں کو بہرہ''

کہا ''پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے''

کہا ''گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسر'' کہا ''مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر''
کہا ''دَر ہو یہ بھی اگر بند اُس پر'' کہا ''اُس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر''

وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق[3] سب اُس کی نحوست سے چھوٹے

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو مبادا[4] کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ[5] حمیت ہے تم کو تو جلدی سے اُٹھو اور اپنی خبر لو

وگرنہ یہ قول آئے گا راست[6] تم پر
کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

رہو گے یونہیں فارغ[7] البال کب تک نہ بدلو گے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک نہ چھوڑو گے تم بھیڑیا چال کب تک

---

[1] آوے کا آوا: پورا خاندان۔
[2] تاسف: افسوس۔
[3] خلائق ۔مخلوق۔
[4] مبادا: ہرگز، ایسا نہ ہو۔
[5] حمیت: غیرت۔
[6] راست: ٹھیک۔
[7] فارغ البال۔

بس اگلے فسانے فراموش [1] کر دو
تعصب کے شعلے کو خاموش کر دو

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں کہ راجا سے پرجا [2] تلک سب سکھی ہیں

تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بد خواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآن کا کوئی
نہ ناقص [3] ہے ملت کے ارکاں کا کوئی نہ مانع [4] شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں

نہ گھر میں غنیم [5] اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق [6] و رہزن [7] کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں شب و روز ہے ایمنی [8] قافلوں میں

سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر [9] کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر [10] کا

---

[1] فراموش: بھول جاؤ۔
[2] پرجا: عوام۔
[3] ناقص: ادھورا۔
[4] مانع: روکنے والے۔
[5] غنیم: چور۔
[6] قزاق: بحری ڈاکو۔
[7] رہزن: لٹیرا۔
[8] ایمنی: امن۔
[9] سقر: دوزخ۔
[10] سراسر ظفر: پوری فتح۔

پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں[1] ہیں ہر ایک بر اعظم کی خبریں کھلی ہیں زمانے پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال رُوئے زمیں کا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں بہت سے نہ چلنے سے پچتا رہے ہیں
مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوٹی ہو منزل

نہ بد خواہ سمجھو بس اب یاروں کو لُٹیرے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو
دو الزام پیچھے نصیحت گروں کو ٹٹولو ذرا پہلے اپنے گھروں کو
کہ خالی ہیں یا پُر ذخیرے تمہارے
بُرے ہیں کہ اچھے وتیرے تمہارے

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیار یاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل[2] سے ہٹ چکا ہے

یہ جو کچھ ہوا ایک شمہ[3] ہے اس کا کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانے نے اُونچے سے جس کو گرایا وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

[1] عیاں: ظاہر۔ [2] مرکزِ ثقل: قوتِ جاذبہ، زمین کی قوت کشش۔ [3] شمہ: ذرہ برابر۔

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

یہاں ہر ترقی کی غایت[1] یہی ہے سر انجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی عادت یہی ہے طلسم[2] جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

کہاں ہیں وہ اَہرام[3] مصری کے بانی کہاں ہیں وہ گردان[4] زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی[5] مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی

لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں[6] کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں[7] کا

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی[8] سب

☆.....☆.....☆

---

[1] غایت: حقیقت۔
[2] طلسم: افسانہ، جادوگری۔
[3] اہرام مصری: پیرامڈس مصری مثلث نما مینار جو دریائے نیل سے پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔ دنیا کی قدیم ترین عمارت ہیں۔
[4] گردان زابلستانی سے مراد رستم کا خاندان ہے۔
[5] کیومرث کی اولاد میں جو گیارہ بادشاہ ہوئے وہ پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے مشہور بادشاہ۔
[6] خالد بابل والے۔
[7] اسفندیار کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو ساسانی کہتے ہیں۔
[8] رفتنی: جانے والے۔

ضمیمہ

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو فسردہ[1] دلوں کے دل آخر بڑھا تو
ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تونے سر سبز کی ہیں

سفینہ پے نوح طوفاں میں تُو تھی سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تُو تھی
زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تُو تھی دل آرام یوسف کی زنداں میں تُو تھی
مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تُو نے بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تُو نے
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تُو نے اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تُو نے
بہت تُو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خُرد و کلاں[2] کی
تجھی پر ہے بنیاد نظم جہاں کی نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اس دکاں کی
تگا پو[3] ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَو[4] ہے ہر قافلہ میں تجھی سے

---

[1] فسردہ: مایوس۔ [2] خُرد و کلاں: چھوٹے بڑے۔
[3] تگاپو: بھاگ دوڑ۔ [4] روارو: حرکت، رفتار۔

کسانوں سے کلر[1] میں تو ہے بُواتی جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ تو ہے چڑھاتی فریدوں[2] کو ضحاک[3] سے ہے لڑاتی
چلے سب جدھر تو نے مائل عناں[4] کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تُو نے تونگر بنایا گداؤں کو تُو نے
دیا دست رس[5] نارواؤں کو تُو نے کیا بادشہ نا خداؤں کو تُو نے
سکندر کو شانِ کئی تُو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تُو نے بخشی

وہ رہ رو[6] نہیں رکھتے جو کوئی ساماں خوروزاد[7] سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں نہ محرم کوئی جو سنے درد پنہاں
ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا سمیں[8] کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا
اگر موج زن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں[9] اور ہو کوہِ غم پر گزرنی ہے جو کچھ گزر جائے ہم پر

---

[1] کلر: سخت زمین جو قابل کاشت نہ ہو۔
[2] فریدوں: ضحاک کو ہلاک کر کے ایران کا بادشاہ ہوا۔
[3] ضحاک ایک قوی اور ظالم بادشاہ تھا۔
[4] عناں: مہار۔
[5] دست رس: مدد کا ہاتھ۔
[6] رہ رو: مسافر۔
[7] خوروزاد: خوراک سامان سفر۔
[8] سمیں: عمدہ موسم۔
[9] فزوں: اضافہ۔

نہیں فکر تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں بو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں[1] ہے عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی نہ اُس میں وہ اسلام کی شان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی
بگڑنے کا گو اُن کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی دلیری نہیں پر حمیت[2] ہے باقی
فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی تہی دست[3] ہیں پر مروت ہے باقی
مٹے پر ابھی پندار[4] ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر
گلیمِ[5] قناعت کو ثروت سے بہتر انہیں موت ہے بارِ منّت سے بہتر
سر اُن کا نہیں دربدر جھکنے والا
وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا

مشابہ ہے قوم اُس مریض جواں سے کیا ضعف نے جس کو مایوس جاں سے
نہ بستر سے حرکت نہ جنبش مکاں سے اجل کے ہیں آثار جس پر عیاں سے

---

[1] زبوں: پست۔ [2] حمیت: شرم، غیرت۔
[3] تہی دست: خالی ہاتھ۔ [4] پندار: غرور۔
[5] گلیم قناعت: قناعت کا کمبل یا لحاف۔

نظر آتے ہیں سب مرض جس کے مزمن[1]
نہیں کوئی مہلک مرض اُس کو لیکن

بجا ہیں حواس اُس کے اور ہوش قائم طبیعت میں میل خور و نوش[2] قائم
دماغ اور دل چشم اور گوش قائم جوانی کا پندار[3] اور جوش قائم
کرے کوئی اس کی اگر غور کامل
عجب کیا جو ہو جائے زندوں میں شامل

عیاں[4] سب پہ احوال بیمار کا ہے کہ تیل اُس میں جو کچھ تھا سب جل چکا ہے
موافق دوا ہی نہ کوئی غذا ہے ہُزالِ[5] بدن ہے زوال قویٰ ہے
مگر ہے ابھی یہ دیا ٹمٹماتا
بُجھا جو کہ ہے یاں نظر سب کو آتا

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خزف[6] کے ہیں انبار گریاں جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں ان میں پنہاں
چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزہ زر[7] بھی ہیں کچھ

جو بےغم ہیں ان میں تو غم خوار بھی ہیں جو بے مہر[8] ہیں کچھ تو کچھ یار بھی ہیں
انہیں غافلوں میں خبردار بھی ہیں خرابات[9] میں چند ہشیار بھی ہیں
جماعت سے اپنی نرالے بھی ہیں یاں
نکموں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں

---

[1] مزمن: پرانا مرض۔
[2] خورونوش: کھانا پینا۔
[3] پندار: غرور، حوصلہ۔
[4] عیاں: ظاہر۔
[5] ہزال بدن: لاغر بدن۔
[6] سفال وخزف: مٹی اور ٹھیکری۔
[7] ریزہ زر: سونے کے ذرات۔
[8] بےمہر: بےمحبت۔
[9] خرابات: شراب خانے۔

جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا[1] کہ ایک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا جہازوں کو ہے زورقوں[2] نے ترایا
یونہیں کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یونہیں جلتا رہا ہے

یہ سچ ہے کہ ہیں بیشتر ہم میں ناداں نہیں جن کے دردِ تعصُّب کا درماں
جہاں میں ہیں جو ان کی عزت کے خواہاں انہیں سے وہ رہتے ہیں دست و گریباں
پہ ایسے بھی کچھ ہوتے جاتے ہیں پیدا
کہ جو خیر خواہوں پہ ہیں اپنے شیدا

کوئی خیر خواہی میں ہے ہمسر اُن کا کوئی دست و بازو سے ہے یاور اُن کا
کوئی ہے زباں سے ستائش[3] گر اُن کا بہت رکھتے ہیں نقشِ حُبّ[4] دل پر اُن کا
بہت اُن کے گن[5] سنتے ہیں چپکے چپکے
بہت سن کے سر دھنتے ہیں چپکے چپکے

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا تمّوج[6] کا جس میں نہ ہرگز پتا تھا
تغیر سے یہ حال اُس کا ہوا تھا کہ مکروہ تھی بو تو کڑوا مزا تھا
ہوئی تھی یہ پانی سے زائل روانی
کہ مشکل سے کہہ سکتے تھے اُس کو پانی

پر اب اُس میں رو کچھ کچھ آنے لگی ہے کناروں کو اُس کے ہلانے لگی ہے
ہوا بلبلے کچھ اُٹھانے لگی ہے عفونت[7] سے وہ پانی سے جانے لگی ہے
اگر ہو نہ یہ انقلاب اتفاقی
تو دریا میں بس اک تموج ہے باقی

---

[1] کایا: قسمت۔ [2] زورقوں: چھوٹی کشتیوں۔
[3] ستائش گر: تعریف کرنے والا۔ [4] نقشِ حُبّ: محبت کا نقش۔
[5] اچھے اخلاق۔ [6] تمّوج: لہروں کا حرکت میں آنا۔
[7] عفونت: سڑی بدبو۔

حوادث[1] نے اُن کو ڈرایا ہے کچھ کچھ مصائب[2] نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ
ضرورت نے رستہ دکھایا ہے کچھ کچھ زمانے کے غسل نے جگایا ہے کچھ کچھ
ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سونے میں کچھ کلبلانے[3] لگے ہیں

راہ راست پر ہیں وہ کچھ آتے جاتے تَعَلّی[4] سے ہیں اپنی شرماتے جاتے
تفاخر[5] سے ہیں اپنے پچتاتے جاتے سراغ[6] اپنا کچھ کچھ ہیں وہ پاتے جاتے
بزرگی کے دعوؤں سے پھرنے لگے ہیں
وہ خود اپنی نظروں سے گرنے لگے ہیں

نہیں گھاٹ پر گو ترقی کے آتے نئی بات سے ناک بھوں ہیں چڑھاتے
نئی روشنی سے ہیں آنکھیں چراتے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہیں کہتے جاتے
کہ دنیا نہیں گرچہ رہنے کے قابل
پر اس طرح دنیا میں رہنا ہے مشکل

تنزل پہ وہ ہات ملنے لگے ہیں کچھ اس سوز سے جی پگھلنے لگے ہیں
دھوئیں کچھ دلوں سے نکلنے لگے ہیں کچھ آرے سے سینوں پہ چلنے لگے ہیں
وہ غفلت کی راتیں گذرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اُترنے کو ہیں اب

نہیں گرچہ کچھ درد اسلام اُن کو نہ بہبودی قوم سے کام اُن کو
نہ کچھ فکر آغاز و انجام اُن کو برابر ہے ہو صبح یا شام اُن کو
مگر قوم کی سن کے کوئی مصیبت
انہیں کچھ نہ کچھ آ ہی جاتی ہے رقّت[7]

---

[1] حوادث: حادثات زمانہ۔ [2] مصائب: درد کے واقعات۔
[3] کلبلانے لگے: بڑبڑانے لگے۔ [4] تَعَلّی: فخر کرنا۔
[5] تفاخر: فخر کرنا۔ [6] سراغ: پتا۔
[7] رقت: رونا دھونا۔

خصومت[1] سے ہیں اپنی گو خواریاں سب نزاعوں[2] سے باہم کی ہیں ناتواں سب
خود آپس کی چوٹوں سے ہیں خستہ جاں[3] سب پہ ہیں متفق اس پہ پیر و جواں سب
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو
اسی جزر و مد[4] نے ڈبویا ہے ہم کو

یہ مانا کہ کم ہم میں ہیں ایسے دانا جنہوں نے حقیقت کو ہے اپنی چھانا
تنزل کو ہے ٹھیک ٹھیک اپنے جانا کہ ہم ہیں کہاں اور کہاں ہے زمانہ
پہ اتنا زبانوں پہ ہے سب کے جاری
کہ حالت بری آج کل ہے ہماری

فرائض میں گو دین کے سب ہیں قاصر[5] نہ مشغول باطن نہ پابند ظاہر
مساجد سے غائب ملاہی[6] میں حاضر مگر ایسے فاسق ہیں اُن میں نہ فاجر
کہ مذہب پہ حملے ہیں جو ہر طرف سے
وہ دیکھ اُن کو ہٹ جائیں راہِ سلف سے

خود اپنی ہے گو قدر و قیمت گنوائی پہ بھولے نہیں ہیں بڑوں کی بڑائی
جو آپ اُن کی خوبی نہیں کوئی پائی تو ہیں خوبیوں پر انہیں کے فدائی
شرف گو کہ باقی نہیں اُن میں اب کچھ
مگر خواب میں دیکھ لیتے ہیں سب کچھ

ذرا پھر کے پیچھے وہ جب دیکھتے ہیں وہ اپنا حسب اور نسب دیکھتے ہیں
بزرگوں کا علم و ادب دیکھتے ہیں سرافرازی[7] جدّ و اب دیکھتے ہیں
تو ہیں فخر سے وہ کبھی سر اٹھاتے
کبھی ہیں ندامت سے گردن جھکاتے

---

[1] خصومت: دشمنی۔ [2] نزاعوں: جھگڑوں۔
[3] خستہ جاں: تھکے ماندے۔ [4] جزرومد: اتارچڑھاؤ۔
[5] قاصر: معذور۔ [6] ملاہی: کھیل کود۔
[7] سرافرازی: سربلندی۔

اگر کچھ بھی باقی ہو یاروں میں ہمت تو اُن کا یہی افتخار اور ندامت
شگون[1] سعادت ہے اور فال دولت کہ آتی ہے کچھ اس سے بوئے حمیت[2]
وہ کھو بیٹھے آخر کمائی بڑوں کی
بھلا دی جنہوں نے بڑائی بڑوں کی

اسیری[3] میں جو گرم فریاد ہیں یاں وہی آشیاں کرتے آباد ہیں یاں
قفس سے وہی ہوتے آزاد ہیں یاں چمن کے جنہیں چہچہے یاد ہیں یاں
وہ شاید قفس ہی میں عمریں گنوائیں
گئیں بھول صحرا کی جن کو فضائیں

بلندی میں ہوں یا کہ پستی میں ہوں تم قوی ہوں کہ کمزور افزوں[4] ہوں یا کم
مُحَقَّر[5] زمانے میں ہوں یا مُکَرَّم موخر[6] ہوں اس بزم میں یا مُقَدّم[7]
عبا میں ہوں پوشیدہ یا شال میں ہوں
کسی رنگ میں ہوں کسی حال میں ہوں

اگر با خبر ہیں حقیقت سے اپنی تلف[8] کی ہوئی اگلی عظمت سے اپنی
بلندی و پستی کی نسبت سے اپنی گذشتہ اور آیندہ حالت سے اپنی
تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا[9] ہمارا
نہیں دُور منجدھار[10] سے کچھ کنارا

الپ[11] ارسلاں سے یہ طغرل[12] نے پوچھا کہ قومیں ہیں دنیا میں جو جلوہ فرما
نشاں اُن کی اقبال مندی کے ہیں کیا کب اقبال مند اُن کو کہنا ہے زیبا

---

[1] شگون سعادت: خوش بختی کا موقع۔ [2] بوئے حمیت: شرم وحیا۔ [3] اسیری: قیدی۔
[4] افزوں: زیادہ۔ [5] مُحقّر: ذلیل۔ [6] موخر: آخری۔
[7] مقدم: اوّل۔ [8] تلف: ضائع ہونا۔ [9] کھیوا: بیڑا۔
[10] منجدھار: طوفان۔
[11] الپ ارسلان: سلجوقیوں کا دوسرا بادشاہ تھا۔
[12] طغرل ارسلان کا چچا تھا جس کے بعد ارسلان بادشاہ بنا۔

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ اُن کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ اُن کے جب تک

جہاں جائیں وہ سرخ رو ہو کے آئیں ظفر ہم عناں[1] ہو جدھر باگ اُٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں نہ اُکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں
کریں مَس[2] کو گر مَس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہات ڈالیں طلا ہو

ولی عہد کی جب کہ باتیں سنیں یہ ہنسا سن کے فرزانہ[3] دور بیں یہ
کہا جان عم[4] گپ ہے گو دلنشیں یہ مگر شرط اقبال ہرگز نہیں یہ
حوادث[5] سہے بن گزارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

بہم ہے کچھ گاہ برہم ہے محفل کٹھن ہے کبھی گاہ آساں ہے منزل
زمانے کی گردش سے بچنا ہے مشکل نہ محفوظ ہیں اس سے مدبر[6] نہ مقبل
بہت یکہ تازوں[7] کو یاں گرتے دیکھا
صدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

جہاں سود ہے یاں وہیں ہے زیاں[8] بھی جہاں روشنی ہے وہیں ہے دھواں بھی
سقر[9] بھی ہے یہ خاک واں اور جناں[10] بھی بہاریں بھی ہیں اس چمن میں خزاں بھی
نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلاتے بھی ہیں
چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے[11] بھی ہیں

---

[1] ہم عناں: ہم رکاب۔
[2] مَس: تانبا۔
[3] فرزانہ دور بیں: عقل مند دور اندیش۔
[4] جان عم: چچا کی جان۔
[5] حوادث: روزانہ کے حالات۔
[6] مدبر و مقبل: بد بخت اور خوش بخت۔
[7] یکہ تازوں: شہسواروں۔
[8] زیاں: نقصان۔
[9] سقر: دوزخ۔
[10] جناں: جنت۔
[11] گہناتے: گہن میں آجاتے ہیں۔

ضعیف اور قوی ارمنی اور عراقی چکھاتا ہے دُردِ قدح[1] سب کو ساقی
پہ اقبال کی ہے رمق[2] جن میں باقی یہ سب تلخیاں اُن کی ہیں اتفاقی
بلاؤں میں گھر کر نکل جاتے ہیں وہ
ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ

نہیں ہوتے نیرنگ گردوں[3] سے حیراں ہر اک درد کا ڈھونڈ لیتے ہیں درماں
اٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں وہ چونک اٹھتے ہیں دیکھ خوابِ پریشاں
بھڑکتے ہیں افسردہ ہو کر سوا وہ
پھبکتے[4] ہیں پژمردہ ہو کر سوا وہ

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر لگاتے ہیں غوطہ اچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لے کے چلنے کی خاطر وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر
سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
الجھتے ہیں پیچھے سلجھتے ہیں پہلے

ضرورت نہیں یہ کہ فرماں[5] روا ہوں رعیت[6] ہوں وہ خواہ کشور کشا[7] ہوں
سپاہی ہوں تاجر ہوں یا ناخدا ہوں وہ کچھ ہوں پہ اپنے سے واقف ذرا ہوں
کہ ہم کیا ہیں اور کون ہیں اور کہاں ہیں
گھٹے یا بڑھے ہیں سبک[8] یا گراں ہیں

جب آئی انہیں ہوش کچھ وقت کھو کر رہیں بیٹھ قسمت کو اپنی نہ رو کر
کریں کوششیں سب بہم ایک ہو کر رہیں داغ ذلت کا دامن سے دھو کر

---

[1] دُردِقدح: ساغر کی بچی شراب، تلچھٹ۔
[2] رمق: تھوڑی چیز۔
[3] نیرنگ گردوں: زمانے کی نیرنگی۔
[4] پھبکتے: تازہ ہوتے ہیں۔
[5] فرماں رواں: حکمراں۔
[6] رعیت: رعایا۔
[7] کشور کشا: حکومت پھیلانے والے۔
[8] سبک یا گراں: ہلکے یا وزنی۔

نہ ہو تابِ پرواز [1] گر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی [2] جہاں تک

پڑا ہے وہی وقت اب ہم پہ آ کر کہ اُٹھے ہیں سوتے بہت دن چڑھا کر
سواروں نے کی راہ طے باگ اُٹھا کر گئے قافلے ٹھہر منزل پہ جا کر
گرافتاں و خیزاں [3] سدھارے بھی اب ہم
تو پہنچے بھلا جا کے منزل پہ کب ہم

مگر بیٹھ رہنے سے چلنا ہے بہتر کہ ہے اہل ہمت کا اللہ یاور
جو ٹھنڈک میں چلنا نہ آیا میسر تو پہنچیں گے ہم دھوپ کھا کھا کے سر پر
یہ تکلیف و راحت ہے سب اتفاقی
چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی

ہوا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے لیا جس نے پھل بیج بو کر لیا ہے
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا [4] ہے مثل ہے کہ کرنے کی سب بدیا [5] ہے
یونہیں وقت سو سو کے جو ہیں گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک [6] اُٹھاتے

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری جہاں دیکھیے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلید [7] درِ فضلِ باری اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور میں اور تو سب

---

[1] تابِ پرواز: اُڑنے کی طاقت۔
[2] رسائی: پہنچ۔
[3] افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے۔
[4] کیمیا: وہ فرضی عمل جس سے سستی دھاتیں سونا میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔
[5] بدیا: ہنر، بزرگی۔
[6] زک: نقصان، شکست۔
[7] کلید: کنجی۔

گلستاں میں جوبن[1] گل و یاسمن کا سماں زلف سنبل کی تاب و شکن[2] کا
قدِ دل رُبا[3] سرو اور نارون کا رُخِ جاں فزا[4] لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے رنگ و بو سب
کمیروں[5] کے خوں سے ہیں یہ تازہ روسب

ہلاتے نہ اگلے اگر دست و بازو جہاں عطر حکمت سے ہوتا نہ خوشبو
نہ اخلاق کی وضع ہوتی ترازو نہ حق پھیلتا رُبع مسکوں[6] میں ہر سو
حقائق یہ سب غیر معلوم رہتے
خدائی کیا اسرار مکتوم[7] رہتے

ستارہ شریعت کا تاباں نہ ہوتا اثر علم دیں کا نمایاں نہ ہوتا
جدا کفر سے نُورِ ایماں نہ ہوتا مساجد میں یوں وِردِ قرآں نہ ہوتا
خدا کی ثنا معبدوں میں نہ ہوتی
اذاں جا بجا مسجدوں میں نہ ہوتی

نہیں ملتی کوشش سے دنیا ہی تنہا کہ ارکان دیں بھی اسی پر ہیں برپا
جنہیں ہو نہ دنیائے فانی کی پروا کریں آخرت کا ہی وہ کاش سودا
نہیں ہلتے دنیا کی خاطر اگر تم
تو لو دین حق کی ہی اُٹھ کر خبر تم

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انساں تفاوت[8] ہے حالت میں جن کی نمایاں
کچھ اُن میں ہیں راحت طلب اور تن آساں[9] بدن کے نگہبان بستر کے دربان

[1] جوبن: چڑھتی جوانی، حسن۔
[2] تاب و شکن: چمک اور حلقے۔
[3] دل رُبا: دل چرانے والا۔
[4] جاں فزا: روح کو طراوت دینے والا۔
[5] کمیروں: وہ مزدور جو کسان کے ساتھ کام کرتا ہے۔
[6] ربع مسکون: دنیا کی ایک چوتھائی خشکی جس پر انسانوں کی آبادی ہے۔
[7] مکتوم: پوشیدہ۔ [8] تفاوت: فرق۔ [9] تن آساں: کاہل۔

نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل
سمجھتے ہیں تنکے کو رستے میں حائل

اگر ہیں تونگر تو بے کار ہیں سب اپاہج[1] ہیں روگی[2] ہیں بیمار ہیں سب
تعیش[3] کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب

برابر ہے یاں اُن کا ہونا نہ ہونا
نہ کچھ جاگنا اُن کا بہتر نہ سونا

اگر ہیں تہی دست اور بے نوا وہ تو محنت سے ہیں جی چراتے سدا وہ
نصیبوں کا کرتے ہیں اکثر گلا وہ ہلاتے نہیں کچھ مگر دست و پا وہ

اگر بھیک مل جائے قسمت سے اُن کو
تو سو بار بہتر ہے محنت سے اُن کو

نہ جو بے نوا ہیں نہ ہیں کچھ توانگر وہ ہیں ڈھور[4] کی طرح قانع[5] اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر

ہوئے زیور آدمیت سے عاری[6]
معطل[7] ہوئیں قوتیں ان کی ساری

نہ ہمت کہ محنت کی سختی اُٹھائیں نہ جرأت کہ خطروں کے میداں میں آئیں
نہ غیرت کہ ذلت سے پہلو بچائیں نہ عبرت کہ دنیا کی سمجھیں ادائیں

نہ کل فکر تھا یہ کہ ہیں اس کے پھل کیا
نہ ہے آج پروا کہ ہوتا ہے کل کیا

نہیں کرتے کھیتی میں وہ جاں فشانی[8] نہ ہل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس[9] کرتی ہے دل پر گرانی تو کہتے ہیں حق کی ہے نا مہربانی

---

[1] اپاہج: معذور۔ [2] روگی: بیمار۔ [3] تعیش: عیاشی کرنا۔
[4] ڈھور: جانور جن سے وزن اٹھانے کا کام لیا جاتا ہے۔
[5] قانع: مطمئن۔ [6] عاری: خالی۔ [7] معطل: ختم۔
[8] جاں فشانی: جاں لگا کر محنت کرنا۔ [9] یاس: ناامیدی۔

نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

کبھی ''کہتے ہیں ہیچ[1] ہیں سب یہ ساماں کہ خود زندگی ہے کوئی دن کی مہماں
دھرے سب یہ رہ جائیں گے کاخ[2] و ایواں نہ باقی رہے گی حکومت نہ فرماں
ترقی اگر ہم نے کی بھی تو پھر کیا
یہ بازی اگر جیت لی بھی تو پھر کیا

یہ سرگرم کوشش میں جو روز و شب ہیں اُٹھاتے سدا بار رنج و تعب[3] ہیں
ترقی کے میداں میں سبقت[4] طلب ہیں نمائش پہ دنیا کی بھولے یہ سب ہیں
نہیں ان کو کچھ اپنی محنت سے لہنا
بناتے ہیں وہ گھر نہیں جس میں رہنا''

کبھی کرتے ہیں عقل انساں پہ نفریں[5] کہ با وصف کوتاہ بینی[6] ہے خود میں
وہ تدبیریں اس طرح کرتی ہے تلقیں[7] کہ گویا کھلا اس پہ ہے سِرِّ تکویں[8]
مگر سب خیالات ہیں خام اُس کے
ادھورے ہیں جتنے ہیں یاں کام اُس کے

نہ اسباب راحت کی اُس کو خبر کچھ نہ آثار دولت کی اُس کو خبر کچھ
نہ عزت نہ ذلت کی اُس کو خبر کچھ نہ کلفت[9] نہ راحت کی اُس کو خبر کچھ
نہ آگاہ اس سے کہ ہستی[10] ہے شے کیا
نہ واقف کہ مقصود ہستی سے ہے کیا

---

[1] ہیچ: بے کار، کچھ نہیں۔
[2] کاخ: محل۔
[3] تعب: رنج، دُکھ۔
[4] سبقت: پہل کرنا۔
[5] نفریں: ملامت۔
[6] کوتاہ بینی: کم نظری۔
[7] تلقین: یقین کرنا۔
[8] سِرِّ تکوین: پیدائش کا بھید۔
[9] کلفت: زحمت۔
[10] ہستی: زندگی۔

کبھی کہتے ہیں زہر ہے مال و دولت اُٹھاتے ہیں جس کے لیے رنج و محنت
اسی سے گناہوں کی ہوتی ہے رغبت[1] اسی سے دماغوں میں آتی ہے نخوت[2]
یہی حق سے کرتی ہے بندوں کو غافل
ہوئے ہیں عذاب اس سے قوموں پہ نازل

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش[3] سے حاصل کہ مقسوم[4] بن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے سلانے کو قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

سنی تم نے یہ جس جماعت کی حالت تنزل کی بنیاد ہے یہ جماعت
بگڑتی ہیں قومیں اسی کی بدولت ہوا اس کی ہے مفسد[5] ملک و ملت
کیا صور و صیدا[6] کو برباد اسی نے
بگاڑا دمشق اور بغداد اسی نے

جہاں ہے زمیں پر نحوست ہے ان کی جدھر ہے زمانے میں نکبت[7] ہے ان کی
مصیبت کا پیغام کثرت ہے ان کی تباہی کا لشکر جماعت ہے ان کی

---

[1] رغبت: کشش۔ [2] نخوت: غرور۔
[3] سعی: کوششیں۔ [4] مقسوم: قسمت کا لکھا۔
[5] مفسد: فسادی۔
[6] صور صیدا: صور شام کا ایک قدیم شہر تھا جس میں یونان کے فلاسفر زندگی بسر کرتے تھے۔ صیدا دمشق کے قریب ایک قدیم شہر تھا جس میں کئی مضبوط قلعے تھے۔
[7] نکبت: افلاس۔

وجود ان کا اصل البلیات[1] ہے یاں
خدا کا غضب ان کی بہتات[2] ہے یاں

سب ایسے تن آسان و بے کار و کاہل تمدن کے حق میں ہیں زہر ہلاہل[3]
نہیں ان سے کچھ نوعِ انساں[4] کو حاصل نہیں ان کی صحبت کہ ہے سَـــــمِّ قاتل[5]
یہ جب پھیلتے ہیں سمٹتی ہے دولت
یہ جوں جوں کہ بڑھتے ہیں گھٹتی ہے دولت

جہاں بڑھ گئی ان کی تعداد حد سے ہوئی قوم محسوب[6] سب دام[7] و دُد سے
رہا اُس کو بہرہ[8] نہ حق کی مدد سے وہ اب بچ نہیں سکتی نکبت کی زد سے
بچو ایسے شوموں[9] کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں[10] سے

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے شرف[11] جس سے نوع بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور و ضیا[12] ہے سب اس باغ کی جن سے نشوونما ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ مہلت طلب وہ لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

---

[1] اصل البلیات: رنج اور دکھ کی جڑ۔ [2] بہتات: زیادہ۔
[3] زہر ہلال: بہت خطرناک زہر۔ [4] نوع انسان: انسانی نسل۔
[5] سَمِّ قاتل: زہر قاتل۔ [6] محسوب: حساب کرتے ہیں۔
[7] دام و دد: مویشی اور جانور۔ [8] بہرہ: فائدہ۔
[9] شوموں: مخولوں۔ [10] یغمائیوں: لٹیروں۔
[11] شرف: عزت، مقام۔ [12] ضیا: روشنی۔

چنیں[1] گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایواں بنیں گر نہ وہ شاہ و کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاں دار بے جاں جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں
یہ چلتی ہے گاڑی اُنہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل[2] ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب وتواں[3] کو گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں[4] کو
سمجھتے نہیں اس میں جان اپنی جاں کو وہ مرمر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے اُن کی
اور اس دُھن میں مرنا شہادت ہے اُن کی

مشقت میں عمر اُن کی کٹتی ہے ساری نہیں آتی آرام کی اُن کے باری
سدا بھاگ دَوڑ اُن کی رہتی ہے جاری نہ آندھی میں عاجز[5] نہ مینھ میں ہیں عاری[6]
نہ لُو جیٹھ[7] کی دم تڑاتی ہے اُن کا
نہ ٹھر[8] ماہ کی جی چھڑاتی ہے اُن کا

نہ احباب کی تیغ احساں کے گھائل نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دُکھ درد میں سوئے آرام مائل نہ دریا و کوہ اُن کے رستے میں حائل
سُنے ہوں کبھی رستم و سام[9] جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام[10] ویسے

کسی کو یہ دُھن ہے کہ جو کچھ کمائیں کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں
کسی کو یہ کد[11] ہے کہ جھیلیں بلائیں پہ احساں کسی کا نہ ہرگز اُٹھائیں

---

[1] چنیں: اس طرح۔
[2] بے کل: بے قرار، بے سکون۔
[3] تاب وتواں: ہمت اور توانائی۔
[4] رواں: روح، جان۔
[5] عاجز: بے کار۔
[6] عاری: خالی۔
[7] جیٹھ: گرمی کا مہینہ۔
[8] ٹھر ماہ: سردی کا مہینہ۔
[9] رستم وسام: ایران کے پہلوان۔
[10] غیور: غیرت مند۔
[11] کد: دکھ، ارادہ۔

کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں
کوئی چور ہے حُبِّ اہلِ وطن میں

جو مصروف ہے کاشتکاری میں کوئی تو مشغول دوکان داری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غم گساری میں کوئی ضعیفوں کی خدمت گذاری میں کوئی

یہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کنبے پہ ہے جان قربان کرتا

کوئی اس تگ و دو[1] میں رہتا ہے ہر دم کہ دولت جہاں تک ہو کیجے فراہم
رہیں جیتے جی تا کہ خود شاد و خرم[2] مریں جب تو دل پر نہ لے جائیں یہ غم

کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند وزن کیا
لباس اُن کا اور اپنا ہو گا کفن کیا

بہت دل میں اپنے یہ رکھتے ہیں ارماں کہ کر جائیں یاں کوئی کارِ نمایاں
وہ ہوں تا کہ جب چشمِ عالم سے پنہاں تو ذکرِ جمیل[3] ان کا باقی رہے یاں

یہی طالبِ شہرت و نام لاکھوں
بناتے ہیں جمہور[4] کے کام لاکھوں

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا[5] کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے نمائش سے بے زار دشمن ریا[6] کے

ریاضت سب اُن کی خدا کے لیے ہے
مشقت سب اُس کی رضا کے لیے ہے

کوئی اُن میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں[7] کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں
کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں کوئی پند و وعظ و جماعت پہ مفتوں

---

[1] تگ ودو: دوڑ دھوپ۔
[2] شاد وخرم: خوش اور خوش حال۔
[3] ذکر جمیل: خوبصورت ذکر۔
[4] جمہور: عوام۔
[5] صدق وصفا: سچائی اور مروت۔
[6] ریا: ریاکاری۔
[7] مفتوں: فاتح، حاصل کیا ہوا۔

کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا

بہت نوع انساں کے غم خوار و یاور ہوا خواہ ملت بہ اندیش[1] کشور
شدائد[2] کے دریائے خوں میں شناور[3] جہاں کی پُر آشوب[4] کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود[5] اُن سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود[6] اُن سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی صعوبت[7] ہے اُن پر کسی کو ہو غم رنج و کلفت[8] ہے اُن پر
کہیں ہو فلاکت[9] مصیبت ہے اُن پر کہیں آئے آفت قیامت ہے اُن پر

کسی پر چلیں تیر آماج[10] یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر[11] تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے یہ پیماں کو میخوں[12] سے ہیں جڑنے والے
یہ فوج حوادث سے ہیں لڑنے والے یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے

امنڈتا[13] ہے رکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا[14]

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

---

[1] بہ اندیش کشور: ملک کی سوچنے والے۔
[2] شدائد: شدید۔
[3] شناور: پیراک۔
[4] پرآشوب: طوفانی۔
[5] ہست و بود: موجودگی۔
[6] نمود: ترقی۔
[7] صعوبت: تکلیف۔
[8] کلفت: سختی۔
[9] فلاکت: مفلسی، غربت۔
[10] آماج: نشانہ۔
[11] رہ گیر: مسافر۔
[12] میخوں: کیلوں۔
[13] امنڈنا: بڑھنا۔
[14] سودا: دماغی خلل، دماغ کا حال۔

مہم [1] بن کیے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت سمائی ہے اُس کی بہت دل میں عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منھ کوئی زحمت نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت
بھروسے پہ اپنے دل دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُر خار اُن کو برابر ہے میدان و کہسار اُن کو
نہیں حائل اُن کے کوئی رہ گذر میں
سمندر ہے پایاب [2] اُن کی نظر میں

اسی طرح یاں اہل ہمت ہیں جتنے کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام اُن کے دم سے فقیر اور غنی سب طفیلی [3] ہیں اُن کے
بغیر اُن کے بے ساز و ساماں تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت [4] کے آثار انہیں سے کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہیں پر ہے کچھ فخر گر ہے کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت انہیں کی ہے سب ربع مسکوں [5] میں برکت

---

[1] مہم: معرکہ۔ [2] پایاب: اتھلا پانی، پانی جس میں گہرائی نہ ہو۔
[3] طفیلی: صدقے میں۔ [4] سعادت: خوش بختی۔
[5] ربع مسکون: ایک چوتھائی خشکی جہاں انسان بستے ہیں۔

دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی [1] خلافت خدا کی

انہیں کا اُجالا ہے ہر رہ گذر میں انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہور ہے سب خشک و تر میں انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں

انہیں سے ہے رتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں [2] نے جھکایا

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے
نجابت [3] ہے ان سے شرافت ہے ان سے شرف ان سے فخر ان سے عزت ہے ان سے

جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی فضیلت نہ عزت نہ فرماں [4] روائی

نہال [5] اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

حکومت ملی اُن کو صَفّار [6] تھے جو امامت کو پہونچے وہ قَصّار [7] تھے جو
وہ قطبِ زماں [8] ٹھہرے عَطّار [9] تھے جو بنے مرجعِ خلق نَجّار [10] تھے جو

---

[1] پھبتی: سجتی۔
[2] روحانیوں: فرشتوں، ملائک۔
[3] نجابت: پاکیزگی۔
[4] فرماں روائی: حکومت۔
[5] نہال: پودا۔
[6] صفار: تانبے کے برتن بنانے والا، خراسان میں 30 برس صفاریوں کی حکومت رہی۔
[7] قصار: دھوبی۔
[8] قطب زماں: زمانے کے مرکز۔
[9] عطار: عطر فروش۔
[10] نجار: بڑھئی۔

اولوالفضل [1] یاں اُٹھے سرّاج [2] کتنے
ابوالوقت ہو گذرے حلّاج [3] کتنے

نہ بو نصر [4] تھا نوع میں ہم سے بالا نہ تھا بو علی [5] کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا ہوئے اس لیے صاحب قدر والا
اگر فکر کسب ہنر تم کو بھی ہو
تمہیں پھر ابو نصر اور بو علی ہو

بڑا ظلم اپنے پہ تم نے کیا ہے کہ عزت کی یاں جس ستوں پر بنا [6] ہے
ترقی کی منزل کا جو رہنما ہے تنزل کی کشتی کا جو ناخدا ہے
قوی پشت تھیں جس سے پشتیں تمہاری
ہوئی دست بردار [7] قوم اُس سے ساری

ہنر ہے نہ تم میں فضیلت ہے باقی نہ علم و ادب ہے نہ حکمت ہے باقی
نہ منطق ہے باقی نہ ہیئت ہے باقی اگر ہے تو کچھ قابلیت ہے باقی
اندھیرا نہ چھا جائے اس گھر میں دیکھو
پھر اُکسا [8] دو اس ٹمٹماتے دیے کو

بہت ہم میں اور تم میں جوہر [9] ہیں مخفی [10] خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ ان کی خبر لی تو ہو جائیں گے مل کے مٹی میں مٹی
یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی
مبادا [11] تلف ہو ودیعت [12] خدا کی

---

[1] اولوالفضل: فضل وکمال حاصل کرنے والے۔ [2] سراج: زین بنانے والا۔
[3] حلاج: روئی دھننے والا۔ [4] ابونصر فارابی معلم ثانی، ساٹھ کتابوں کا مصنف۔
[5] بوعلی: بوعلی سینا۔ [6] بنا: عمارت۔
[7] دست بردار: ہاتھ اٹھانے والا، بے تعلقی کرنے والا۔ [8] اکسانا: چھیڑنا۔
[9] جوہر: قابلیت۔ [10] مخفی: پوشیدہ۔
[11] مبادا: ایسا نہ ہو۔ [12] ودیعت: امانت۔

یہی نوجواں پھرتے آزاد جو ہیں کمینوں کی صحبت میں برباد جو ہیں
شریفوں کی کہلاتے اولاد جو ہیں مگر ننگ [1] آبا و اجداد جو ہیں
اگر نقد فرصت [2] نہ یوں مفت کھوتے
یہی فخر آبا و اجداد ہوتے

یہی جو کہ پھرتے ہیں بےعلم و جاہل بہت ان میں ہیں جن کے جوہر ہیں قابل
رذائل [3] میں پنہاں ہیں ان کے فضائل انہیں ناقصوں میں ہیں پوشیدہ کامل
نہ ہوتے اگر مائل لہو [4] و بازی
ہزاروں انہیں میں تھے طوسی [5] و رازی

یہی قوم ہے جس میں قحط آدمی کا جہاں شور ہے ہر طرف ناکسی [6] کا
نہیں جہل میں جس کے حصہ کسی کا کبھی علم و فن پر تھا قبضہ اسی کا
وہ تھیں برکتیں سعی و کوشش کی ساری
وہی خوں ہے ورنہ رگوں میں ہماری

حکومت سے مایوس تم ہو چکے ہو زر و مال سے ہات تم دھو چکے ہو
دلیری کو ڈھک ڈھک کے منھ رو چکے ہو بزرگی بزرگوں کی سب کھو چکے ہو
مدار [7] اب فقط علم پر ہے شرف کا
کہ باقی ہے ترکہ یہی اک سلف کا

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں کہ ہے علم سرمایہ فخر انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اُس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

---

[1] ننگ: ذلت۔
[2] نقدفرصت: فرصت کی پونجی۔
[3] رذائل: ذلت آمیز کام۔
[4] لہووبازی: کھیل تماشا۔
[5] طوسی ورازی: قدیم اسلامی علما۔
[6] ناکسی: قحط الرجال۔
[7] مدار: بھروسہ۔

جواہر تھا اک سب کی نظروں میں بھاری پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری نہ تھیں طاقتیں اُس کی معلوم ساری
پہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ ہے علم میں زور دستِ الٰہی

کیا کوہساروں کو مسمار[1] اس نے بنایا سمندر کو بازار اس نے
زمینوں کو منوایا دوّار[2] اس نے ثوابت[3] کو ٹھہرایا سیّار اس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت[4] آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا زمیں کے خزانے اُگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر[5] ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بے پر اُڑاتا

تمدن کے ایواں کا معمار ہے یہ ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار[6] ہے یہ کہیں جنگجویوں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اس نے
بنایا ہے روباہ[7] شیروں کو اس نے

اسی کی ہے اب چار سو حکمرانی کیے اس نے زیر ارمنی[8] اور یمانی
ہوئے رام دیوان[9] ماژندرانی گئے زابلی[10] بھول سب پہلوانی

---

[1] مسمار: نابود، بےنشان۔ [2] دوار: گردش کرنے والا۔
[3] ثوابت: ستارے جو حرکت نہیں کرتے۔ [4] سکت: طاقت۔
[5] نامہ بر: خط لے جانے والا۔ [6] اوزار: آلات۔
[7] روباہ: لومڑی۔ [8] ارمنی و یمانی: ارمنستان اور یمن کے باشندے۔
[9] دیوانِ ماژندرانی: ایران ماژندارن کے قدیم پہلوان۔
[10] زابلی: زابل جہاں سے رستم کا تعلق تھا۔

ہوا اس کی طاقت سے تسخیر [1] عالم
پڑے سامنے اس کے چرکس [2] نہ دیلم

یہ لاکھوں پہ ہے سیکڑوں کو چڑھاتا سواروں کو پیادوں سے ہے زک [3] دلاتا
جہازوں سے ہے زورقوں [4] کو بھڑاتا حصاروں [5] کو ہے چٹکیوں میں اُڑاتا
ہوا کوئی حربوں [6] سے اس کے نہ سر بر [7]
نہ ٹھہری زرہ [8] اس کے آگے نہ بکتر [9]

جنہوں نے بنایا اُسے اپنا یاور ہر اک راہ میں اُس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آج کل صادق آتا ہے اُن پر کہ اک نوع ہے نوع انساں سے برتر
الگ سب سے کام اُن کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب ہیں انساں تو وہ اور ہیں کچھ

بہت اُن کو معجز نما جانتے ہیں بہت دیوتا اُن کو گردانتے ہیں
پہ جو ٹھیک ٹھیک اُن کو پہچانتے ہیں وہ اتنا مقرر [10] انہیں مانتے ہیں
کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کمائی
وہ سب جزو کل اُن کے حصے میں آئی

کیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا نہ ہمسر رہا کوئی اُن کا نہ ہمتا
ہر اک چیز اُن کی ہر اک کام اُن کا سمجھ بوجھ سے ہے زمانے کی بالا
صنائع [11] کو سب اُن کے تکتے ہیں ایسے
عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

---

[1] تسخیر عالم: عالم کو فتح کرنا۔
[2] چرکس نہ دیلم: چرکس چرکیا کے باشندے، دیلم کاسپین دریا جو شمالی ایران میں روس میں شامل ہے قدیم شہر ہے۔
[3] زک: شکست۔
[4] زورقوں: چھوٹی کشتیاں۔
[5] حصار: زورقوں۔
[6] حربہ: جنگ وجدل۔
[7] سر بر: فاتح۔
[8] زرہ: لوہے کا لباس حفاظت کے لیے۔
[9] بکتر: لوہے کی کڑیوں کا پرہن
[10] مقرر: قیمت والے۔
[11] صنائع: صنعتیں۔

دیے علم نے کھول اُن پر خزانے چھپے اور ظاہر نئے اور پرانے
بتائے انہیں غیب کے مال خانے دکھائے فتوحات کے سب ٹھکانے
ہوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر
وہ یوں چھا گئے خاور اور باختر[1] پر

یہ سچ ہے کہ ہے اصل تعلیم دولت رہی ہے سدا پشت حکمت حکومت
ہوئی سلطنت جن کی دنیا سے رخصت نہ علم ان میں باقی رہا اور نہ حکمت
نہ یونان محکوم ہو کر رہا کچھ
نہ ایران تاج اپنا کھو کر رہا کچھ

یہ اک خارکش صبر و ہمت میں کامل یہ کہتا تھا محنت سے گھٹتا تھا جب دل
کہ جن سختیوں کا اٹھانا ہے مشکل وہی ہیں کچھ اے دل اُٹھانے کے قابل
حلال آدمی کو ہے کھانا نہ پینا
نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینا

نہیں سہل گر صید[2] کا ہات آنا تو لازم ہے گھوڑوں کو سر پٹ بھگانا
نہ بیٹھو جو ہے بوجھ بھاری اُٹھانا ذرا تیز ہانکو جو ہے دُور جانا
زمانہ اگر ہم سے زور آزما ہے
تو وقت اے عزیزو یہی زور کا ہے

کر دیا اپنے بزرگوں کی حالت شدائد[3] میں جو ہارتے تھے نہ ہمت
اُٹھاتے تھے برسوں سفر کی مشقت غریبی میں کرتے تھے کسب فضیلت
جہاں کھوج پاتے تھے علم و ہنر کا
نکل گھر سے لیتے تھے رستہ اُدھر کا

---

[1] خاوراور باختر: سورج اورافق۔
[2] صید: شکارکیاہواجانور۔
[3] شدائد: مصیبتیں۔

عراقین[1] و شامات[2] و خوارزم[3] و توراں[4] جہاں جنسِ تعلیم سنتے تھے ارزاں[5]
وہیں پے سپر[6] کر کے کوہ و بیاباں پہنچتے تھے طلاب[7] افتاں و خیزاں[8]
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا تانتا[9] بندھا تھا
نظامیہ[10] نوریہ[11] مستنصریہ[12] نفیسیہ[13] ستیہ[14] اور صاحبیہ[15]
رواحیہ[16] عزیہ[17] اور قاہریہ[18] عزیزیہ[19] زنیسنیہ[20] اور ناصریہ[21]

[1] عراقین: عرب عراق اور عجم عراق جو ایران کا پہاڑی سلسلہ ہے۔
[2] شام کے مختلف حصوں کو شامات کہتے ہیں۔
[3] خوارزم: خراسان کے شمال میں بحیرہ خوارزم یعنی جھیل یورال کا حصہ جس پر کئی سلاطین نے حکومت کی اور چنگیز خان نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔ اب یہ علاقہ روس کے تحت ہے۔
[4] توران: دریائے سندھ سے جھیل یورال تک کا علاقہ۔ اب یہ حصہ روس اور دوسری سلطنتوں میں شامل ہے۔
[5] ارزاں: سستا۔
[6] پے سپر: طے کر کے۔
[7] طلاب: مذہبی طالب علم۔
[8] افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے۔
[9] تانتا: سلسلہ۔
[10] نظامیہ: اسلامی مدرسے جو نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان نے بنوائے۔ پانچ مدرسے ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں تھے۔
[11] نوریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں نورالدین ارسلان موصل نے بنوایا۔
[12] مستنصر: مستنصر باللہ عباسی کا اسلامی مدرسہ بغداد میں۔
[13] نفیسہ: اسلامی مدرسہ، بانی کا نام نامعلوم۔
[14] ستیہ: دمشق میں صلاح الدین ایوبی کی بیٹی خاتون کا بنوایا ہوا اسلامی مدرسہ۔
[15] صاحبیہ: اسلامی مدرسہ قاہرہ میں صاحبیہ وزیر صفی الدین کا بنوایا ہوا۔
[16] رواحیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں ابوالقاسم کا بنوایا ہوا۔
[17] عزیہ: اسلامی مدرسہ بیت المقدس، بانی کا نام معلوم نہیں۔
[18] قاہریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں، بانی کا نام معلوم نہیں۔
[19] عزیزیہ: اسلامی مدرسہ بغداد میں، بانی کا نام نامعلوم۔
[20] زنیسنیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں، بانی کا نام نامعلوم۔
[21] ناصریہ: اسلامی مدرسہ ناصر الملک کا بنوایا ہوا قبرص میں۔

یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کردی [1] و قپچاقیوں [2] کے

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے جہاں تک ہو کام آپ اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو گر آپ ہانکو

بہت خوان [3] بے اشتہا [4] تم نے کھائے بہت بوجھ بندھ بندھ کے تم نے اُٹھائے
بہت آس پر ساز کی راگ گائے بہت عارضی تم نے جلوے دکھائے
بس اب اپنی گردن پہ رکھو جوا [5] تم
کرو حاجتیں آپ اپنی روا تم

تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمہیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے کرو گے تمہیں کچھ اگر یاں کرو گے
چھپا دست ہمت میں زور قضا [6] ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

سراسر ہو گو سلطنت فیض گستر [7] رعیت [8] کی خود تربیت میں ہو یاور
مگر کوئی حالت نہیں اس سے بدتر کہ ہر بوجھ ہو قوم کا سلطنت پر

---

[1] کردی: کردستان کے باشندے جن کا ہیرو صلاح الدین ایوبی تھا جس نے بیت المقدس فتح کیا۔
[2] قپچاقیوں: تاتاری قوم جو بحیرۂ ہسپین کے شمال میں رہتے ہیں۔
[3] خوان: کھانے کے دسترخوان۔
[4] بے اشتہا: بغیر بھوک۔
[5] جوا: وہ لکڑی جو بنڈی میں بیل کی گردن پر رکھی جاتی ہے۔
[6] قضا: تقدیر۔
[7] گستر: پھیلا ہوا۔
[8] رعیت: رعایا۔

ہو اس طرح ہاتوں میں اُس کے رعیت
کہ قبضے میں غسّال کے جیسے میت

وہی گُر تجارت کے اُس کو سجھائے وہی صنعت اور حرفت اُس کو بتائے
وہی کاشتکاری کے آئیں [1] سکھائے وہی اُس کو لکھوائے وہ ہی پڑھائے
ملا جس رعیّت کو ایسا سہارا
کیا آدمیت نے اس سے کنارا

یہی سلطنت کی ہے کافی اعانت [2] کہ ہو ملک میں امن اُس کی بدولت
نفوس [3] اور اموال کی ہو حفاظت حکومت میں ہو اعتدال [4] اور عدالت
نہ توڑا رعیت پہ بے جا ہو کوئی
نہ قانون چھٹ کار فرما ہو کوئی

جہاں ہو یہ انداز فرماں روائی [5] رعیت کی ہے واں نپٹ [6] بے حیائی
کہ ہر کام میں آس ڈھونڈے پرائی کرے آپ اپنی نہ مشکل کشائی
کھڑا ہو سہارے اک اڑوار [7] کے گھر
ہٹی وہ جہاں آ رہے یہ زمیں پر

گیا اب وہ دل تنگیوں کا زمانہ کہ اپنوں کا حصہ تھا پڑھنا پڑھانا
برہمن کا پہنے اگر شدر بانا [8] تو اُس پر نہیں کوئی اب تازیانہ
ہوئے برطرف سب نشیب و فراز [9] اب
سفید و سیہ میں نہیں امتیاز اب

---

[1] آئین: قانون۔
[2] اعانت: مدد، امداد۔
[3] نفوس: عوام، لوگ۔
[4] اعتدال: میانہ روی، برابری۔
[5] فرماں روائی: حکومت، حکمرانی۔
[6] نپٹ: تمام۔
[7] اڑوار: لکڑی جو چھت کے نیچے لگاتے ہیں۔
[8] بانا: کپڑے۔
[9] نشیب و فراز: نیچے اور اوپر۔

بس اب وقت کا حکم ناطق[1] یہی ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
یہی آج کل اصل فرماندہی ہے اسی میں چھپا سر[2] شاہنشی ہے
ملی ہے یہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

سکھاتی ہے محکوم کو یہ اطاعت سجھاتی ہے حاکم کو راہِ عدالت
دلوں سے مٹاتی ہے نقشِ عداوت جہاں سے اُٹھاتی ہے رسمِ بغاوت
یہی ہے رعیت کو حق دار کرتی
یہی ہے کہ و مہ کو ہموار کرتی

سنی ہے غریبوں کی فریاد اسی نے کیا ہے غلامی کو برباد اسی نے
ریپبلک[3] کی ڈالی ہے بنیاد اسی نے بنایا ہے پبلک[4] کو آزاد اسی نے
مقید بھی کرتی ہے یہ اور رہا بھی
بناتی ہے آزاد بھی با وفا بھی

تجارت نے رونق ہے یہ اس سے پائی کہ ہیچ اس کے آگے ہے فرماں روائی
فلاحت[5] کی یہ منزلت ہے بڑھائی کہ فلاح کرتے ہیں معجز نمائی
ترقی یہ صنعت کو دی ہے بلا کی
کہ ہوتی ہے معلوم قدرت خدا کی

یہ نا اتفاقی ہے قوموں سے کھوتی یہ قومی محبت کا ہے بیج بوتی
یہ آپس کے کینے دلوں سے ہے دھوتی یہ دانے ہے سب ایک لڑ میں پروتی
یہ نقطوں پہ خط کی طرح ہے گزرتی
کروڑوں دلوں کو ہے یہ ایک کرتی

---

[1] ناطق: بولتا۔ [2] سر: رمز۔
[3] ریپبلک: جمہور۔ [4] پبلک: عوام۔
[5] فلاحت: درخت لگانے کی صنعت۔

جہاں یہ نہیں واں نہ قوم اور نہ ملت نہ ملکی حمایت نہ قومی حمیّت [1]
جُدا سب کے رنج اور جُدا سب کی راحت الگ سب کی ذلت الگ سب کی عزت
خبر واں نہیں یہ کہ ہے قوم شے کیا
چھپا سِـــرِّ حق اس تعلق میں ہے کیا

جنہوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت نہ جانی مسلط ہوئی اُن پہ ذلت
ملوک [2] اور سلاطیں نے کھوئی حکومت گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت [3]
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

نہ چلتے ہیں واں کام کاریگروں کے نہ برکت ہے پیشے میں پیشہ وروں کے
بگڑنے لگے کھیل سوداگروں کے ہوئے بند دروازے اکثر گھروں کے
کماتے تھے دولت جو دن رات بیٹھے
وہ ہیں اب دھرے ہات پر ہات بیٹھے

ہنر اور فن واں ہیں سب گھٹتے جاتے ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے طبیب اور اُن کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر
نہ ناظم ہیں سرسبز اُن کے نہ ناثر [4]

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکینکس کی رو میں تاراج ہیں وہ

---

[1] حمیت: شرم وحیا۔ [2] ملوک: حکمراں۔
[3] نکبت: نحوست۔ [4] ناثر: نثر لکھنے والا۔

نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت[1] کا گھروں میں

جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت[2]
ہو تجار پر بند راہِ معیشت دکانوں میں ڈھونڈی نہ پائے بضاعت[3]
پرائے سہارے ہیں بیو پار واں سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تُجّار واں سب

یہ ہیں ترک تعلیم کی سب سزائیں وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

لیے فرد بخشیِ دوراں کھڑا ہے ہر اک فوج کا جائزہ لے رہا ہے
جنہیں ماہر اور کرتبی دیکھتا ہے انہیں بخشتا تیغ و طبل و لِوا[4] ہے
پہ ہیں بے ہنر یک قلم چھٹتے جاتے
رسالوں[5] سے نام اُن کے ہیں کٹتے جاتے

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہ ترقی ہو آساں امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں[6]
کوئی اُن میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتی دین و ملت کو تھامے

---

[1] عاریت: مانگا ہوا۔ [2] اہل حرفت: اہل ہنر اور انڈسٹری۔
[3] بضاعت: دولت، کمائی۔ [4] لوا: جھنڈا۔
[5] رسالوں: فوجی دستے۔ [6] تاباں: چمک دار۔

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل زمانے میں ہو منھ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی اپنی مدد وہ

کرو قدر اُن کی ہنر جن میں پاؤ ترقی کی اور اُن کی رغبت[1] دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انہیں سر پہ اپنے پرائے

کرو گے اگر ایسے لوگوں کی عِزّت تو پاؤ گے اپنے میں تم اک جماعت
بڑھائے گی جو قوم کی شان و شوکت گھرانوں میں پھیلائے گی خیر و برکت
مدد جس قدر تم سے وہ آج لے گی
عوض[2] تم کو کل اُس کا دہ چند[3] دے گی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے ہنر پر جہاں پیر و برنا[4] فدا تھے
تمدن کے میداں میں زور آزما تھے وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے
مقاصد بڑے اور ارادے تھے عالی
نہ تھا اس سے چھوٹا بڑا کوئی خالی

سبب کچھ نہ تھا اس کا جز قدر دانی کہ ہوتے تھے جو علم و حکمت کے بانی
ترقی میں کرتے تھے جو جاں فشانی حیات اُن کو ملتی تھی واں جاودانی[5]
وطن جیتے جی اُن پہ قرباں تھا سارا
پس از مرگ پجتے[6] تھے وہ آشکارا

---

[1] رغبت: علاقہ۔ [2] عوض: بدلے۔
[3] دہ چند: دس برابر۔ [4] پیر و برنا: بوڑھے اور جوان۔
[5] جاودانی: ہمیشہ زندہ رہنا۔ [6] پجتے: پرستش کیے جانا۔

اسی گُر نے تھا جوش سب کو دلایا کہ تھا اک جزیرے نے رتبہ یہ پایا
اسی شوق نے تھا دلوں کو بڑھایا اسی نے تھا یوناں کو یوناں بنایا
اس امید پر کوششیں تھیں یہ ساری
کہ ہر قوم کے دل میں عظمت ہماری

جنھیں ملک میں اپنی رکھنی ہو وقعت[1] جنہیں سلطنت کی ہو مطلوب قربت
جنہیں تھامنی ہو گھرانے کی عزت جنہیں دین کی ہو نہ منظور ذلت
جنہیں نسل و اولاد ہو اپنی پیاری
انہیں فرض ہے قوم کی غم گساری [2]

بہت دل ہیں نرم ان دنوں ہوتے جاتے کہ حالت پہ ہیں قوم کی اُمڈے آتے
تنزل پہ ہیں اُس کے آنسو بہاتے نہیں آپ کچھ کر کے لیکن دکھاتے
خبر بھی ہے دل اُن کے جلتے ہیں کس پر
وہ ہیں آپ ہی ہات ملتے ہیں جس پر

رئیسوں کی جاگیر داروں کی دولت فقیہوں کی دانشوروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت
جچے تب کچھ آنکھوں میں اہلِ وطن کے
جو کام آئے بہبود [3] میں انجمن کے

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہو گی جڑ اس گلستاں میں جس کی

---

[1] وقعت: عزت، قیمت۔
[2] غم گساری: غم منانا، غم میں شریک ہونا۔
[3] بہبود: بھلائی۔

ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا تو بھاگا جماعت میں ہے اپنی آتا
انہیں ساتھ لے لے کے ہے یاں سے جاتا فتوح[1] اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا
سدا اُن کے ہیں اس طرح کام چلتے
کمائی سے ایک ایک کی لاکھوں ہیں پلتے

جب اِک چیونٹا جس میں دانش نہ حکمت بنی نوع کی اپنے برلائے حاجت
معیشت سے ایک اک کو بخشے فراغت کرے اُن پہ وقف اپنی ساری غنیمت[2]
تو اس سے زیادہ ہے بے غیرتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

غضب ہے کہ جو نوع ہو سب سے برتر گنے آپ کو جو کہ عالم کا سرور
فرشتوں سے جو سمجھے اپنے کو بڑھ کر خدا کا بنے جو کہ دنیا میں مظہر
نہ ہو مردمی کا نشاں اُس میں اتنا
مسلم ہے مٹی کے کیڑوں میں جتنا

الٰہی بحق رسولِ تہامی[3] ہر ایک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی برابر تھے مکی و زنگی[4] و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اس کا اور اُس کی عترت[5] کا یا رب پکڑ ہات جلد اُس کی امت کا یا رب
اک ابر اُس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب غبار اس سے جو دھو دے ذلت کا یا رب
کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اُس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اس کی

---

[1] فتوح: آمدنی۔ [2] غنیمت: لوٹا ہوا مال۔
[3] تہامی: مدنی۔ [4] زنگی: زنگبار کا رہنے والا۔ حبشی
[5] عترت: اولاد۔

بچا اُن کو اس تنگنائے بلا[1] سے کہ رستہ ہو گم رہ رو[2] و رہنما سے
نہ اُمید یاری ہو یار آشنا سے نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں اُمیدوں کی جا حسرتیں ہوں
انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کمیں گاہِ[3] بازیِ دوراں دکھا دے جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں[4] تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

☆.....☆.....☆

---

[1] تنگنائے بلا: بلاؤں کا گھیراؤ۔
[2] رہ رو: راستہ چلنے والا۔
[3] کمیں گاہ: شکارگاہ۔
[4] پاٹ لیں: ڈھک لیں، بنالیں۔

عرضِ حال

بہ جنابِ سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات

اے خاصہ خاصان[1] رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء[2] ہے

جس دین کے مدعو[3] تھے کبھی سیزر و کسری[4]
خود آج وہ مہمان سرائے[5] فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دِیا ہے

جو دین کو تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے[6] اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوعِ بشر[7] تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اُس میں بپا ہے

---

[1] خاصہ خاصان: خاصوں میں خاص۔
[2] غریب الغرباء: غریبوں میں غریب۔
[3] مدعو: دعوت دی گئی۔
[4] سیزر و کسری: روم اور ایران کے شہنشاہ۔
[5] مہمان سرائے: مسافر خانے۔
[6] تفرقے: پھوٹ۔
[7] بنی نوع بشر: انسانی نسل۔

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر[1] غنا بھی
اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عُرضہ[2] تیغِ جہلا و سفہا[3] ہے

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب[4]
اب معترض اُس دین پہ ہر ہرزہ درا[5] ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمہ صافی
دین داروں میں پر آب[6] ہے باقی نہ صفا[7] ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم[8] ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلس اعیان[9] ہے وہ بزم شرفا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ ونوا[10] ہے

ہے دین کی دولت سے بہا علم سے رونق
بے دولت وعلم اُس میں نہ رونق نہ بہا ہے

---

[1] اکسیر: دوا، مجرب نسخہ۔
[2] عرضہ: ڈھال۔
[3] سفہا: کمینے۔
[4] مغلوب: شکست خوردہ۔
[5] ہرزہ درا: بے ہودہ، نامعقول۔
[6] آب: چمک۔
[7] صفا: پاکیزگی، صفائی۔
[8] منعم: مال دار، انعام کرنے والا۔
[9] اعیان: سرمایہ دار۔
[10] بے برگ ونوا: بے کار، بے قیمت۔

شاہد ہے اگر دین تو علم اُس کا ہے زیور
زیور ہے اگر علم تو مال اُس کی جِلا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اُس قوم کی اور دین کی پانی پہ بِنا[1] ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دَور زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بفلک گنبد اقبال
ادبار[2] کی اب گونج رہی اُس میں صدا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اُس کے ہوا ہے

وہ روشنی بام[3] و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو
اُس قوم کا ایک ایک گھر اب بزمِ عزا ہے

چاؤش[4] تھے للکارتے جن رہ گذروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے

---

[1] بنا: بنیاد۔ [2] ادبار: نحوست، پستی۔
[3] بام: چھت۔ [4] چاؤش: نگہبان۔

وہ قوم کہ آفاق[1] میں جو سر بفلک تھی
وہ یاد میں اسلاف[2] کی اب رُو بقفا[3] ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم[4] کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج اُن کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بےطبل و درا[5] ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم قضا[6] ہے

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا[7] کے
اب خوف ہے مدت سے دلوں میں نہ رجا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

کی زیب بدن سب نے ہی پوشاک کتاں کی
اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہے

درکار ہیں یاں معرکے میں جوشن و خفتاں[8]
اور دوش پہ یاروں کے وہی کہنہ درا ہے

---

[1] آفاق: افلاک۔
[2] اسلاف: اجداد۔
[3] رویقفا: پیچھے کی طرف۔
[4] حکم: حکمت۔
[5] درا: گھنٹی۔
[6] قضا: تقدیر۔
[7] رجا: ترقی۔
[8] جوشن وخفتاں: زرہ اور خفتان وہ کرتا جو زرہ کے نیچے پہنا جاتا ہے۔

دریائے پر آشوب ہے اک راہ میں حائل
اور بیٹھ کے گُھڑناؤ[1] پہ یاں قصد شنا ہے
ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہے
یاں نکلے ہیں سو دے کر درم کے پرانے
اور سکہ رواں شہر میں مُدّت سے نیا ہے
فریاد ہے اے کشتی اُمت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمہ رحمت بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے
صدمہ دُرِ دنداں[2] کو ترے جن سے کہ پہنچا
کی اُن کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہے
کی تو نے خطا عفو ہے اُن کینہ کشوں[3] کی
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحُّم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
منقول[4] اُنہیں سے تری پھر مدح و ثنا ہے
برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہے

---

[1] گھڑناؤ: چھوٹی ناؤ۔
[2] دُرِّ دنداں: دانتوں کے گوہر۔
[3] کینہ کشوں: کمینوں۔
[4] منقول: لکھی ہوئی۔

کر حق سے دعا اُمت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے ہیں ہمارے
وہ تیری محبت تری عِترت کی وِلا ہے

ہر چپقلشِ [1] دہر مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

جو خاک ترے در پہ ہے جاروب [2] سے اُڑاتی
وہ خاک ہمارے لیے داروئے شفا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے سے کشش اُس کی ہر اک دل میں سوا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ اور زیادہ
اخبار میں [3] اَلطَّالِحُ لِیْ ہم نے سنا ہے

---

[1] چپقلش: اَن بَن، مخالفت۔
[2] جاروب: جھاڑو۔
[3] اخبار: احادیث میں، حدیث ہے ''بُرے لوگ میرے لیے ہیں۔''

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
امت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزہ ہے

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِّ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلہ ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبش لب خارج[1] از آہنگ خطا ہے

☆.....☆.....☆

[1] ع: ''یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے'' حالی نے یہاں عرفی کے فارسی مصرعے کے آخری لفظ ''است'' کو ''ہے'' سے بدل کر مصرع مکمل کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں ہر بات سوچ سمجھ کر کہنا چاہیے کیونکہ کوئی لفظ جو ہونٹوں کی حرکت سے نکلے اس میں وہ متانت، فرماں برداری، عجز و انکساری نہ ہو تو وہ خود خطاوار ہو جاتا ہے۔

کتابیات

۱	دیوان حالؔی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	مطبع انصاری دہلی ۱۸۹۳ء
۲	کلیات نظم حالؔی (اوّل ودوم)	مرتّبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	لاہور ۱۹۶۷ء
۳	مجموعہ نظم حالؔی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۱۸ء
۴	مسدس حالؔی	مرتّبہ ڈاکٹر عابد حسین	حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۳۵ء
۵	جواہرات حالؔی	مرتّبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو پانی پت ۱۹۲۲ء
۶	مسدس حالؔی	مرتّبہ انوار الحسن	تیج کمار نول کشور ۱۹۶۰ء
۷	مقالات حالؔی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۷ء
۸	مکتوبات حالی حصہ اوّل دوم	مرتبہ خواجہ سجاد حسین	حالی پریس پانی پت ۱۹۲۵ء
۹	یادگار غالب	خواجہ الطاف حسین حالؔی	شانتی پریس الٰہ آباد
۱۰	مقدمہ شعر وشاعری	مرتّبہ رفیق حسین	رام دیال اگروال الٰہ آباد
۱۱	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالؔی	ترقی اُردو بیورو دہلی ۱۹۹۰ء
۱۲	یادگار حالؔی	صالحہ عابد حسین	انجمن ترقی اُردو ۱۹۹۵ء
۱۳	حالؔی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	قومی کونسل برائے فروغ اُردو دہلی
۱۴	حالؔی مقدمہ اور ہم	وارث علوی	اُردو رائیٹرس گلڈ الٰہ آباد ۱۹۸۳ء
۱۵	تذکرۂ حالؔی	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو ۱۹۳۵ء
۱۶	چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	کراچی ۱۹۵۰ء

۱۷	Halis Musaddas	Syeda Saiyidain Hameed	Harper collins Publisher Delhi 2003
۱۸	دیوان حالی مع شرح	اصغر حسین لدھیانوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۵ء
۱۹	اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۱۹۵۶ء لکھنو
۲۰	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمان اعظمی	۱۹۷۲ء دہلی
۲۱	حالؔی	مالک رام	۱۹۸۰ء دہلی
۲۲	الطاف حسین حالؔی	خلیق انجم	۱۹۸۸ء دہلی
۲۳	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	۱۹۷۰ء دہلی
۲۴	خواجہ الطاف حسین حالؔی	شہزاد انجم	اُردو اکادمی ۲۰۰۷ء
۲۵	عکس اور آئینے	سید احتشام حسین	سرفراز پریس لکھنو ۱۹۶۲ء
۲۶	فن سوانح نگاری کا ارتقا	الطاف فاطمہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۴ء
۲۷	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۲ء
۲۸	حرف ادب	شجاعت علی سندیلوی	نامی پریس لکھنو ۱۹۷۸ء
۲۹	حالی کے شعری نظریات	ممتاز حسین	سعد پبلیکیشنز کراچی ۱۹۷۸ء
۳۰	اُردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھ پوری	رام نرائین لال الہٰ آباد ۱۹۴۵ء
۳۱	اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	سرفراز قومی پریس لکھنو ۱۹۶۹ء
۳۲	تنقیدی مضامین	مرتبہ مظفر اقبال	رام نرائین لال الہٰ آباد ۱۹۶۳ء
۳۳	تنقید و تجزیہ	ابو محمد سحر	کتابستان الہٰ آباد ۱۹۶۱ء
۳۴	Famous Urdu poest & Writers	Abdul Qadir	New Book Society Lahore 1947

۳۵	تجربے اور روایت	ابواللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۳۶	تنقیدیں اور خاکے	جلیل قدوائی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۳۷	تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	مشتاق بک ڈپو، کراچی
۳۸	ادب و آگہی	مجتبیٰ حسین	مکتبہ افکار، کراچی
۳۹	اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر سید محمد الحسن رضوی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۰	قدیم دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ دریا آبادی	شاہد پبلیکیشنز
۴۱	اُردو میں تنقید	محمد احسن فاروقی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۲	انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	مکتبہ جدید لاہور
۴۳	اُردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	انجمن ترقی اردو، پاکستان
۴۴	غیر مدون کلام	گلدستہ انجمن	مطبوعہ مطبع اکبری، دہلی ۱۲۸۴ھ
۴۵	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	نومبر ۱۹۰۷ء
۴۶	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	دسمبر ۱۹۰۷ء
۴۷	غیر مدون کلام	بچوں کا اخبار	لاہور، جولائی ۱۹۰۵ء
۴۸	غیر مدون کلام	ماہنامہ مخزن	لاہور، جنوری ۱۹۴۹ء
۴۹	غیر مدون کلام	نقوش شمارہ نمبر ۹۶	جنوری ۱۹۶۳ء
۵۰	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
۵۱	حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خان	مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۶۶ء

☆.....☆.....☆